کہانیاں
گم ہوجا ہیں
فاطمہ حسن

کہانیاں گم ہوجاتی ہیں

فاطمہ حسن

کہانیاں گم ہو جاتی ہیں

فاطمہ حسن

Kahanian Gum Ho Jaati Hain

By. Fatima Hassan

اشاعت : ستمبر ۲۰۰۰ء

کمپوزنگ : احمد گرافکس، کراچی

طباعت : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

تقسیم کار

۱۔ فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، کراچی۔

۲۔ ویلکم بک پورٹ
اردو بازار، کراچی۔

۳۔ مکتبہ دانیال، کراچی
عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

۴۔ فکشن ہاؤس
مزنگ روڈ، لاہور۔

ناشر

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

scheherzade@altavista.com

انتساب

امی سیدہ کنیز فاطمہ (مرحومہ)
اور ان تمام ماؤں کے نام
جنہوں نے بیٹیوں کو سچ
لکھنے کا حوصلہ دیا

فہرست

کہانیاں خواب دیکھتی ہیں

ضمیر علی بدایونی

فاطمہ حسن نے خود کو پہلی بار نثری نظموں میں دریافت کیا۔ لیکن یہ ادھورے وجود کی دریافت تھی:

گہری ہوتی شام
لان کی خالی کرسیاں
اور ادھوری لڑکیاں

بظاہر تو یہ ایک سادہ سی مختصر نظم ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو ان تین مصرعوں میں نسائی شعور کی زخمی اور سراپا احتجاج روح موجود ہے۔ اس نظم کا اختصار دراصل آرٹ کی اس قوت کا اظہار ہے جو فطرت کے طویل عمل کو مختصر کر دیتا ہے۔ فرانسیسی شاعر اور نقاد پال والیری نے کہا تھا:

Art shortens the process of nature

پال والیری کا یہ قول غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، لیکن یہ آدھا سچ ہے۔ پورا سچ تو کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اس قدر اضافہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ آرٹ فطرت کی تکرار کو تخلیقی ارتقاء سے جوڑ دیتا ہے۔ اور فطرت کے عمل کو انسانی واردات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ فاطمہ کی کہانیاں اس نسائی شعور (Female consciousness) کا تسلسل ہیں جو اس نظم میں Originate ہوتا ہے۔

یہ نسائی شعور فاطمہ کی کہانیوں کو اس کی شاعری سے مربوط کر دیتا ہے۔ ادھورے وجود کی دریافت فاطمہ کے فن کو ایک وحدت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اور اس کی ساری تخلیقی کاوشیں ایک بیانیے (Narrative) کا حصّہ محسوس ہوتی ہیں۔

نسائی شعور یا نسائیت کی تحریک دراصل عورت کی اس شخصیت کی تلاش ہے جو معاشرتی روّیوں میں کہیں گم ہوگئی ہے۔ فاطمہ کی کہانیاں دراصل اس آئینے کی کرچیں جمع کرنے کی کوشش ہے جو معاشرتی تصادم میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ لیکن یہ نسائی شعور کا عمومی پہلو ہے جسے فاطمہ نے انفرادی شکست و ریخت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

مشرقی پاکستان کے سانحے نے فاطمہ کو ایک ایسی صورت حال سے دو چار کیا جسے وجودی ادیب و مفکر Marginal situation کا نام دیتے ہیں۔ یعنی موت اور زندگی کی درمیانی لکیر۔ فاطمہ اس لکیر پر دوڑتی ہوئی بحیرۂ عرب کے ساحلوں تک پہنچ گئی۔ لیکن تاریخ کے اس ہولناک تجربے نے اس کے فنکارانہ شعور کو زخمی کر دیا۔ یہ زخم کبھی مندمل نہ ہو سکے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کافکا کی کہانی ”دیہاتی ڈاکٹر“ کے مریض کے زخم کی طرح فاطمہ کے زخم بھی یادوں کی مانند حافظہ سے شعور کی جانب سفر کرتے رہتے ہیں۔ دور کہیں تیشہ چلا تھا جس کی آواز کے پیچھے دوڑتے ہوئے فاطمہ کی حسّاس روح آزردہ اور زخمی ہوگئی۔ ماضی کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے یہ زخم اپنا اندمال ڈھونڈ رہے ہیں۔ فاطمہ فرار کا راستہ اختیار نہیں کرتی بلکہ ان زخموں کو گلے لگاتی ہے اور انہیں اپنے فن میں سجاتی ہے۔ تاکہ تاریخی سانحہ، انفرادی واردات اور ادبی دستاویز بن سکے۔ فاطمہ کی کہانیاں دائمی سچائیوں سے جڑی ہوئی ہیں لیکن انہیں پیش انفرادی طور پر کیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگ ان سچائیوں کے درمیان زندگی گزار دیتے ہیں لیکن انہیں اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ فنکار ان سچائیوں کا ادراک کرتا ہے، اظہار کرتا ہے انہیں حیاتی پیکر عطا کر کے مرئی بنا دیتا ہے۔ فاطمہ کی کہانیاں عقلی صداقت (Rational turth) سے گریز کرتی ہیں اور حیاتی سچ (Vital turth) کو پیش کرتی ہیں۔ جسے جرمن فلسفی دنیائے زیست (Life world) کہتے ہیں۔ فاطمہ کی کہانیوں سے جو عالمی تناظر (World view) بنتا ہے وہ دنیائے زیست کا نسائی شعور ہے۔ ایک مابعد جدید (Post modern) دانشور اور نسائی شعور کی علمبردار ژولیا کرسٹیوا کہتی ہے کہ عورت نام کی کوئی چیز موجود نہیں بلکہ ہونے (becoming) کے عمل میں گرفتار ہے۔ فاطمہ نے کرسٹیوا سے مختلف بات کہی ہے، اس کے نزدیک کائنات میں عورت

کی پیدائش پری میچور ہے۔ تکمیل کے عمل سے پہلے ہی اسے اس دنیا میں پھینک دیا گیا۔ عورت کا سارا المیہ تخلیق کے عمل کی تکمیل سے پہلے وجود میں آنے کا المیہ ہے۔ اسی لیے عورت ہونے کے عمل میں گرفتار ہے۔ اسی لیے وہ سماج میں جنس ثانی (Second sex) کی حیثیت میں زندہ رہتی ہے اور معاشرتی رویوں سے متصادم رہتی ہے اور اسی لیے اس کا وجود ذیلی اور ثانوی بن جاتا ہے کیونکہ معاشرتی اقدار سے اس کو خود کو Adjust کرنا ہے، وہ معاشرہ جس کی بنیاد Male domination پر رکھی ہوئی ہے۔ فاطمہ حسن کی کہانیاں اس نئے شعور سے بہرہ ور ہیں اس کی کہانیاں بلیک آرٹ، پری میچور، برتھ، وہ مجھے دیکھتی رہی، عام سی لڑکی اور دوسری کہانیاں عورت کا ایک ایسا عکس پیش کرتی ہیں جو خود عورت نے دیکھا ہے۔ فاطمہ کی کہانیاں نسائی کائنات Women's world کو بے نقاب کرتی ہیں۔ وہ عورت کے اس احساس کو نام دیتی ہے جو اس کے وجود کا انفرادی رنگ ہے۔ اس رنگ کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں:

''کہیں آنے والا وہ ہو جس کا تم انتظار کر رہی ہو۔ تم نے دیکھا میں ایک مخصوص انداز میں چلتی ہوں۔ میرے پیروں کی چاپ دوسروں سے کتنی مختلف ہے۔ میں اپنا تعاقب خود کرتی رہوں گی۔

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے میرا بت لے کر وہاں اپنا مجسمہ رکھ دے گا۔ تبادلہ سمجھوتے نہیں...... شاید کسی دن کوئی ہوا کا تیز جھونکا آئے اور یہ بت گر کر ٹوٹ جائے۔ پھر ان میں سے بے شمار چھوٹے چھوٹے مجسمے نکلیں گے جو اس کے ہوں گے۔ کاش وہ خود ہی اسے توڑ دے مگر میں اسے نہیں بتاؤں گی اس کے اندر کیا ہے۔ میرے اندر کیا ہے۔ میں بالکل عام سی لڑکی نہیں۔''

(عام سے لڑکی)

عورت اور مرد کے رشتے میں فاطمہ عام ڈگر پر نہیں چلتی بلکہ وہ ایک ایسے راستے کا انتخاب کرنا چاہتی ہے جو عورت کی Dignity کے مطابق ہو۔ یہ بت اور مجسمے اگر ٹوٹ بھی جائیں تو ان کی جگہ دوسرے بت اور مجسمے لے لیتے ہیں۔ یہ ایک راز ہے جسے وہ فاش نہیں کرنا چاہتی۔

فاطمہ Bad faith پر شرمسار نہیں بلکہ وہ فطرت کے آئینے میں عورت کو دیکھتی بھی ہے اور دکھاتی بھی ہے۔ وہ اس حقیقت کا بھی شعور رکھتی ہے کہ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں

سکتی اور یہ جانتی ہے کہ انسان زندگی بھر روح اور مادّے کے درمیان یکساں فاصلے پر چلتا رہتا ہے۔ محبت ایک روحانی روایت ہے لیکن......

دل کی محبت جسم پر ختم ہوجاتی ہے۔

یہ محبت کی تکمیل ہے یا اس کا زوال۔ فاطمہ اس سوال کا جواب نہیں دیتی اور قاری کو آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ وہ اپنی معنویت خود پیدا کرے، اپنے دل کو خود ٹٹولے۔ اس لیے کہ خلا اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ اس کی ایک کہانی ''چھوٹے بڑے لوگ'' کا ایک کردار کہتا ہے:

''ہاں یہ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ میں کبھی یوں ہی پنجوں پر کھڑا اپنے قد پر نازاں تھا۔ مگر وہ ایک رات تھی جب ہوائیں تیز ہوگئیں مجھے توازن برقرار رکھنا مشکل نظر آیا۔ تب میں نے جھک کر اپنے ہاتھوں سے زمین کا سہارا لیا۔ اس روز اچانک احساس ہوا کہ بلندیاں صرف اوپر کی جانب نہیں۔ خلا جتنا اوپر کی طرف ہے اتنا ہی ہم نے اپنی ذات میں اتار لیا ہے اگر اسے نکال دیں تو پھر ہم مکمل ہوجائیں گے۔ یہ میرا احساس تھا جو مجھے ان دونوں قسم کے لوگوں سے نکال لایا۔ مگر اب یہ دونوں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔

تب میں نے چاہا کہ میں ان دونوں قسم کے لوگوں کو چھوڑ کر اس کے برابر کھڑی ہوجاؤں۔ میں اس کے قریب آ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے تھام لیا پھر اچانک وہ اونچا ہوگیا اتنا اونچا کہ میں خود کو بہت چھوٹا سمجھنے لگی۔ مجھے اس کا جملہ یاد آیا۔ میں نے ہواؤں کی شدت سے گھبرا کر زمین کو تھاما تھا۔ اب دل چاہتا ہے کہ میں خوب ہنسوں اور اس کا مذاق اڑاؤں۔

(چھوٹے بڑے لوگ)

اس کہانی میں فاطمہ نثری نظم کی طرف واپس لوٹ گئی ہے۔ اس نے کہانی اور نثری نظم کو ایک وحدت بنانے کی کوشش کی ہے۔ انسانی ذہن تضادات میں وحدت اور وحدت میں تضادات تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس کی یہ ساری تگ و دو اس پہلی اور قدیم ہم آہنگی کی طرف واپس لوٹنے کی کوشش ہے جو فطرت اور انسان، موت و زیست اور ذہن و جسم کو حاصل تھی۔ مرد اور عورت ایک ہی وجود کا حصہ تھے۔ جب کائنات میں وحدت کا شعور بیدار ہوا تو امتیازات مٹ گئے۔ فاطمہ اونچ نیچ، نشیب و فراز اور بلندی و پستی کی وادیوں میں بھٹکتی انسانیت کو وحدت کے شعور سے بہرہ ور کرنا چاہتی ہے جو اس کا جوہر ہے۔ وہ تاریخ کی رَو کو اس سمت موڑنا چاہتی ہے

جہاں مساوات اور آزادی کی کھلی اور کشادہ فضا ہو جس کی آغوش میں تھکی اور پژمردہ انسانی روح اپنی تمناؤں کی تجدید کر سکے اور اپنے لافانی خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ سکے، فطرت اور تاریخ کے آئینے میں اپنے چہرے کے اوّلین نقوش دیکھ سکے جو ایک وحشی رقص کی گرد سے دھندلا چکے ہیں۔ فاطمہ کا یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوگا؟ آئیے ہم سب مل کر فاطمہ کے اس خواب میں شریک ہو جائیں جس میں معصومیت ہے، حسن ہے اور بہتر انسانیت کی نوید ہے۔

ان کہانیوں میں فاطمہ نے اپنے خوابوں کو کاغذ پر اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ان کہانیوں میں احساس کی گہرائی، جذبے کی شدت، تاریخ کا شعور اور تکنیک کی تازہ کاری موجود ہے۔ ان کہانیوں کا ایک سرا اجتماعی شعور سے ملا ہوا ہے تو دوسرا سرا اس تحریک سے جڑا ہوا ہے جو عورت کی انسانی صورت حال Human Condition کو ایک بہتر ماحول فراہم کرنے کے لیے چلائی گئی ہے۔ تاریخی طور پر اس تحریک کو مختلف شخصیتیں توانائی اور خون تازہ فراہم کرتی رہیں جن کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

نسائی شعور کی بیداری یا تحریک نسائیت (Feminist movement) کی ابتداء کا سراغ لگانا ذرا مشکل کام ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس فضا میں کئی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک آواز ورجینا ولف کی بھی ہے جس نے اپنی مشہور اور اہم تصنیف A room of one's own کے ذریعے عورتوں کو بیداری کا پیغام دیا اور ان کی تہذیبی شناخت کا اثبات کیا اور ادبی دنیا میں سوچنے کا ایک نیا انداز روشناس کرایا جسے "نسائی نقطہ نظر" Feminist point of view کا نام دیا گیا۔ یہ نقطہ نظر عورت کی انفرادی شخصیت اور غیر ثانوی حیثیت کا جرات مندانہ اظہار تھا جس نے معاشرے میں مرد کے غلبے کو تنقید کا نشانہ بنایا اور باعزت بقائے باہمی کی اقدار کو فروغ دیا۔ ورجینا وولف کے بعد فرانس کی دانشور مصنفہ سموں دی بوائر کا نام تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس نے نسائی شعور کی لے کو بلند تر کیا اس کے نغمہ آزادی کو نئے آہنگ سے آشنا کیا۔ دی بوائر نے نسائی شعور کے اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی کی۔ سموں دی بوائر نے اپنی کتاب Second sex میں عورتوں کے احتجاج کو ایک فلسفیانہ سمت دی اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھا جس میں مساوات اور عدم امتیاز کی اقدار کا غلبہ ہو۔ اس کے بعد کئی خواتین دانشور نسائی شعور کے افق پر نمودار ہوئیں۔ مابعد جدید عہد Post modern age کے آغاز میں کئی خواتین کے نام سنائی دیے گئے۔ لیکن سب سے نمایاں و ممتاز نام فرانس کی

ژولیا کرسٹیوا کا ہے جس نے Women's time کا تصور دیا اور نسائی شعور کو مابعد جدید عہد میں داخل کر دیا۔ اس نے بین المتینت (Inter texuality) کا تصور دے کر مرد اور عورت کی آویزش اور متصادم اناؤں Egos in coflict کو متنی انا Textual ego میں تبدیل کر دیا۔ لیکن کرسٹیوا نے عورت کی موجودہ صورت حال کو Becoming سے تعبیر کیا جس میں ایک احتجاج کے ساتھ امید کی چنگاریاں بھی دبی ہوئی ہیں۔

اردو ادب میں جن خواتین نے نسائی شعور کی تحریک کو آگے بڑھایا ان میں عصمت چغتائی، جیلانی بانو، فہمیدہ ریاض، خالدہ حسین، بانو قدسیہ، کشور ناہید، پروین شاکر، عذرا عباس اور فاطمہ حسن کے نام نمایاں ہیں۔ فاطمہ حسن کی کہانیاں اس نسائی شعور کی توسیع کرتی ہیں اور اپنی انفرادیت کا رنگ جماتی ہیں۔ فاطمہ کا اپنا ایک لہجہ اور بات کرنے کا اپنا انداز ہے۔ اس کی نثری نظمیں اور کہانیاں اس نفسیاتی جنگ کو بہتر اظہار سے آشنا کرتی ہیں جو دو جنسوں کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ لیکن وہ تصادم اور پیکار کی جانب جانے سے گریزاں ہے۔ وہ امن، مساوات اور آزادی کی پیغامبر ہے۔ اس کی کہانیاں قاری کی فکر کو محدود نہیں کرتیں بلکہ ایک نئی آزادی اور تعبیر و توضیح کے نئے امکانات سے آشنا کرتی ہیں۔ اور اس طرح تخلیق کی کثیر الجہتی کا اثبات کرتی ہیں۔ فاطمہ کے خواب سچ ہیں اس لیے کثرت تعبیر سے پریشاں ہونے کا خوف نہیں ہے۔ خوابوں کا زوال آرٹ کا زوال ہے۔ یہ کہانیاں اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ فاطمہ میں خواب دیکھنے کی صلاحیت زندہ اور توانائی سے بھرپور ہے۔ اس لیے اس کے فن کو اندیشہ زوال نہیں۔ اسی لیے فاطمہ حسن کے فن سے ہماری توقعات کے افق روشن ہیں۔

کہانیاں گم ہو جاتی ہیں

فاطمہ حسن

ان کہانیوں میں زیادہ تر پرانی کہانیاں ہیں۔ جب شائع کرنے کے لیے جمع کیں تو ان میں سے کئی کھوچکی تھیں۔ کہانیاں گم ہوجاتی ہیں، کبھی الفاظ کی تہہ میں کبھی احساس کی گہرائی میں۔ لیکن مشکل تو اس وقت پیش آتی ہے جب لکھنے والا گم ہوجائے۔ اس طرح کے وہ خود کو بھی نظر نہ آئے۔ آج جب میں اس لڑکی کو ڈھونڈھتی ہوں جو کہانیاں لکھتی تھی، تو وہ صرف ان تحریروں میں اگر موجود ہے تو ہے۔ باہر کہیں نہیں ہے۔

نئی زمین پر نوارد کچی عمر کی وہ لڑکی اپنے جیسے لکھنے والوں کے درمیان ادب کی نئی جہتوں کا سراغ لگانے نکلی تو ایسی سمتوں تک بھی پہنچ گئی جو بہت مانوس نہ تھیں۔ یہ نامانوس فضا تخلیقی حیرت بن کر کہانیوں اور نظموں میں شامل ہوتی گئیں۔ پھر نہ جانے کہاں کہانی انگلی چھڑا کر گم ہوگئی۔ بس شاعری کبھی بچھڑتی کبھی ملتی مسلسل ساتھ رہی۔ کبھی کبھی کہانی کی یاد آئی پر زندگی کے دوسرے مسائل نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ فائلوں پر Submitted as desired لکھتے لکھتے اچانک ایک دن احساس ہوا کہ وہ جو لکھنا چاہتی تھی، رنگوں سے تصویری کہانیاں بناتی تھی کس راہ پر چلی گئی کہ اب لفظ بھی اس کا سراغ نہیں دے رہے۔ اُسے ڈھونڈھنے نکلی تو یہ کہانیاں ملیں۔ آصف فرخی نے کہا انھیں چھپنا چاہیے۔ عذرا عباس نے کہا کہ ضرور چھپنا چاہیے۔ بلکہ اسے مزید کہانیاں لکھنی چاہیے۔ سوچتی ہوں تلاش کروں گی اس لڑکی کو جو رونے، ہنسنے اور حیرت زدہ

ہونے کے لیے صرف لفظوں کا سہارا لیتی ہے۔

بات یہ ہے کہ کہانی لکھنے کے عمل میں لکھنے والے کا اپنا وجود بار بار سامنے آتا ہے مگر وہ اتنے ٹکڑوں اور اتنے کرداروں میں بٹا ہوتا ہے کہ اسے جوڑ کر کسی ایک ذات کی شناخت مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتی ہے۔ وہ ایک ذات مختلف کرداروں میں تحلیل رہتی ہے اور کہانی کی رو تھامے رہتی ہے۔ مگر وہ اپنی تکمیل کے ساتھ کہاں ہے؟

اس سوال کا جواب اگر لکھنے والے کو مل جائے تو پھر سارا مسئلہ ختم ہو جائے۔ تخلیق کا عمل اسی سوال کا مرہونِ منّت ہے۔ ہونا اور اپنی شناخت کے ساتھ ہونا۔ وہ مقام ہے جہاں پہنچنے کی خواہش لکھنے والے کو بار بار تخلیق کے عمل سے گزارتی ہے۔ اس کوشش میں وہ معنویت سے بے معنویت تک داخلیت سے خارجیت تک جاتے کس کس مقام سے گزرتا ہے۔ بار بار لہولہان ہوتا ہے۔ آئینے میں اپنا عکس تلاش کرتا ہے اور پھر اپنے ہونے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ اس تلاشِ مسلسل میں اگر وہ کوئی بڑا تخلیقی کام کر جاتا ہے تو ابدیت کی اس منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جہاں وہ پہنچنا چاہتا ہے ورنہ مکڑی کی طرح اپنی ذات سے نکلنے کی کوشش میں اوپر جاتا اور نیچے گرتا رہتا ہے۔

وہ لڑکی جو کہانی سنتی پڑھتی اور ان کے کرداروں کے ساتھ سوتی جاگتی تھی جب لکھنے کے عمل میں داخل ہوئی تو ایک نیم خوابیدہ نیم بیدار فضا میں رہنے کی عادی ہو چکی تھی۔ لیکن اکثر تلخ حقیقتوں کا تند و تیز جھونکا اس فضا میں داخل ہو کر لڑکی کو مضطرب کر دیتا تب یہ اضطراب ......اس کی آنکھوں اور تحریروں میں اتر آتا۔ وہ روتی نہیں لکھتی تھی۔ مگر قریب رہنے والے اس وحشت کو دیکھ لیتے تھے جو اس کی آنکھوں میں ہوتی وہ کتابوں میں پناہ لینے کی عادی تھی۔ مگر زمینی کھیل نے اس کی پناہ گاہ چھین لی تھی۔ اس نے سرحدوں کو ٹوٹتے اور زمین کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔ ایسے میں وہ الفاظ جو اس سے چھین لیے گئے تھے اس نے خود جوڑنے شروع کر دیئے۔ وہ کتابیں جو اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھیں گھر اور زمین کی طرح چھوڑ آئی تھی۔ عزیزوں اور دوستوں کی محبتیں بھی بساطِ زندگی پر پٹے ہوئے مہروں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر چکی تھیں۔ نئے رشتوں کی پناہ تک آنے سے پہلے اسے اپنے آپ کو جوڑے رکھنا تھا اور اپنے مانوس نیم خوابیدہ ماحول کو اجنبی موسموں سے بچانا تھا اس سارے عمل میں وہ جن احساسات سے گزر گئی اور جو کردار اس کے مشاہدے میں آئے ان کی جھلک ان کہانیوں میں کہیں کہیں موجود ہے۔

بلیک آرٹ

ڈرائنگ روم میں میرے ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ ابھی میرے پاس آیا تھا ''چلو تم بھی کھیلو نا ہمارے ساتھ، یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو''۔

''نہیں میں نہیں کھیلوں گی۔ وہی اینٹ کا غلام، پان کی بیگم، کیا چارم ہے اس میں''۔

''چارم! چارم! آخر تمہیں کس چیز میں چارم نظر آتا ہے۔''

اپنی سوچ میں جو ہر لمحہ نئی ہوتی ہے، میں نے دھیرے سے کہا۔

''فلسفی بنتی ہیں''۔ وہ بڑبڑاتا ہے۔

آخر کچھ چارم ہے تبھی تو ہم کھیلتے ہیں۔ ورنہ''.....اس کی آواز دور ہوگئی۔ چارم تو تمہارے لیے تاش کے پتوں سے زیادہ ایک دوسرے کی ذات میں ہے۔ تاش کے پتے تو قربت کا ایک بہانہ ہیں۔ مگر تمہارے معصوم ذہن اس سے بے خبر ہیں۔ بڑے خوش نصیب ہیں یہ لوگ۔ حقیقت کی تلخیوں سے دور۔ مگر میں لمحہ لمحہ یہ کڑوے گھونٹ پی رہی ہوں۔ بظاہر خاموش اور پرسکون بیٹھی۔

اس روز اس نے آکر مجھ سے کہا تھا ''کل میں رات بھر سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ننگے پیر۔ جانتی ہو کس لیے۔ مگر تم کیوں جاننا چاہو گی؟ تمہیں مجھ سے کیا واسطہ؟''

وہ متوقع تھا میری نظریں جھک جھک جائیں گی اور میں بھی اس کی طرح جذبات سے بھاری ہوتی ہوئی آواز میں کہوں گی۔نہیں، واسطہ تو بہت ہے۔

مگر میں نے اس سے کہا تھا، ''ظاہر ہے میرے لیے اپنی ذات کا واسطہ کافی ہے''

''کبھی تو اپنی ذات سے نکل کر دیکھا کرو''۔

سب کو مجھ سے یکساں شکایت ہے۔مگر اسے کیا معلوم کہ میں نے اپنی ذات سے نکل کر نہ صرف اسے دیکھا ہے بلکہ اس کے آنے والے دنوں کو بھی، جب اس کے تمام تقاضوں کی غلام ایک سیدھی سادی سی بیوی آجائے گی تو اس کی تمام حماقتیں ہیولوں کا روپ دھار لیں گی جو اس کا مذاق اڑائیں گی۔تو وہ میرا اس سے بھی زیادہ بھیانک ہیولا بنا کر ان کے سامنے رکھ دے گا۔ اتنا بھیانک ہیولا کہ پچھلے تمام ہیولے ہنسنا بھول جائیں گے۔

میں اپنی ذات سے نکل کر بہت کچھ دیکھتی ہوں۔کل وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔''مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں ٹاور سے گر گئی ہوں۔ میں بہت ٹوٹی ہوں، بہت ٹوٹ گئی ہوں، میں تمہیں کیسے بتاؤں؟ بس ایسا لگ رہا ہے کہ وہ جو شراب بڑے پیار سے مجھے پلا رہا تھا، اس میں زہر ملا ہوا تھا۔ اور وہ زہر میری رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ اس نے پچھلے تین سال میں ایک لڑکی کی تصویر بنائی تھی۔ اتنی بھیانک تصویر کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں''۔ وہ چپ ہوجاتی ہے۔

''پھر کیا ہوا؟''میں نے پوچھا۔

''پھر اس نے وہ تصویر ایک خوبصورت کاغذ میں لپیٹ کر مجھے دے دی اور جانتی ہو؟ کیا کہا اس نے؟ اس نے کہا یہ تصویر تمہاری ہے یعنی میری''۔

کتنا بھیانک مذاق تھا اس کا۔اف کاش یہ مذاق ہی ہوتا۔مگر یہ حقیقت ہے۔

''تم کیوں پریشان ہو۔تصویر تو تمہاری نہیں تھی'' میں نے پوچھا۔

''تم نہیں جانتی، تصویریں بنانا اس کا مشغلہ ہے اور میں جانتی ہوں کہ اس مرتبہ اس کا ماڈل میں ہوگی۔ کتنی خوف ناک بات ہے لوگ میرے ماڈل میں اتنا بھیانک روپ دیکھیں گے۔ میں کیا کروں، کیا کروں۔'' وہ چپ ہوجاتی ہے۔

میں بھی خاموش ہوں۔ بات میرے لیے کچھ زیادہ نئی نہیں۔ کہنے کا انداز الگ ہے۔

ایک معصوم سی لڑکی اس روز کہہ رہی تھی، ''اس نے مجھے اپنے دوستوں سے ملانا چاہا تو میں نے اس کی خوشی جان کر قبول کرلیا میں اس کے تمام دوستوں سے اتنے ہی خلوص سے ملتی رہی

جیسے وہ خود۔ مگر میں بھول گئی کہ لڑکوں سے دوستی میں بھی کچھ برائی ہے۔ مگر جب میں نے اپنے دوست بنائے تو اس نے مجھے آوارہ کہہ دیا۔

تم ہی بتاؤ یہ آوارگی کیسے ہے؟ اس کی ذات مجھ سے الگ تو نہیں۔ وہ مجھے روک دیتا۔ اپنے گھر لے جا کر سات پردوں میں چھپا دیتا۔ میں یہی چاہتی ہوں، مگر اس نے مجھ پر الزام کیوں لگایا۔"

میں نے اسے نہیں بتایا کہ یہ الزام کیوں لگایا گیا۔ مگر میں کڑوے گھونٹ پینے کی عادی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ بے قصور تھا۔ وہ خود کو دھوکا دینا چاہتا تھا۔ اسے بھی ایک بھیانک تصویر بنانی تھی۔

ابھی وہ تاش کے پتے پھینک کر آ جائے گا۔ اور بڑی معصومیت سے پوچھے گا "تم کیا سوچتی رہتی ہو؟ ہمیں بتاؤ نا!"

میں اسے نہیں بتاؤں گی کہ میں کیا سوچتی ہوں اسے کیا معلوم کہ میں ان بھیانک لوگوں سے اُکتا کر اس کی معصومیت میں پناہ لیتی ہوں اور نہ میں اسے یہ بتاؤں گی۔ کیونکہ میں یہ نہیں چاہتی کل مجھے اس کا روپ مسخ کرنا پڑے۔

پری میچیور برتھ

رات بھر الٹے سیدھے خواب دیکھنے کے بعد صبح جب میں بیدار ہوتی ہوں تو میرا ذہن منوں بوجھ تلے دبا ہوتا ہے۔ کچھ نیند کا غبار اور کچھ خواہشات کا بوجھ۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے بتادوں کہ ان راتوں میں وہ کبھی کبھی اتنا قریب ہوتا ہے، اتنا قریب کہ ابھی تک دبے دبے لفظوں میں جتنا کچھ اظہار کیا ہے اس سے بھی زیادہ۔ لیکن میں اسے کچھ نہیں بتاتی کیونکہ میں بہت چالاک ہوں۔ اپنی ممی سے بھی زیادہ۔ اسی وجہ سے تو میں اتنی شوخ اور چنچل نظر آتی ہوں۔

رات کی تمام گرد صبح شاور کے حوالے کر کے جب باتھ روم سے نکلتی ہوں تو رات کی سوچی ہوئی ساری باتیں بے وقوفی معلوم ہوتی ہیں۔ اور میں پھر تروتازہ ہوجاتی ہوں۔

مجھے سنجیدگی بالکل پسند نہیں۔ اس طرح عورتیں وقت سے پہلے بوڑھی ہوجاتی ہیں اور میں جوانی کا یہ سنہرا روپ اتارنا نہیں چاہتی۔ تبھی تو میں اپنی سوچوں کو صرف سوچ تک محدود رکھتی ہوں۔ میں بڑی سمجھ دار بھی ہوں نا۔ اپنی ممی سے بھی زیادہ۔

کیونکہ ممی نے اپنے کتنے ہی اندیشوں کو چھپانے کے لیے چہرے پر سنجیدگی کا نقاب چڑھالیا ہے۔ اور سنا ہے وہ اس وقت بھی جب میں بہت چھوٹی تھی اتنی ہی سپید ہوا کرتی تھیں جتنی ابھی۔ اور اتنی ہی سنجیدہ بھی۔

ممی بالکل بے وقوف ہیں۔ لوگوں نے تو تسلیم کر لیا تھا کہ میں ستوانسی پیدا ہوئی ہوں۔ پھر اندیشے کیسے۔ اور میرا دبلا پن تو ان کا تحفظ کر رہا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ سہمی رہیں اور اب بھی جبکہ اس قسم کی غلطی کا کوئی امکان نہیں رہا۔

اس دن جب میں نے اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھتے ہوئے کہا تھا "ممی کیا میں پری مچیور برتھ ہوں ......تو ان کے چہرے کی سپیدی اور بڑھ گئی تھی۔

اور انھوں نے چونک کر ابو کے کمرے کی طرف دیکھا تھا۔ تب مجھے خیال آیا۔ کہ یہ بات اتنی زور سے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ ممی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بس اس دن سے انھیں میری پامسٹری کی تمام کتابوں سے دشمنی ہوگئی۔ ان کی اس دشمنی اور چہرے کی سپیدی نے مجھے صحیح جواب بتا دیا تھا۔ پھر میں نے سوچا، ممی واقعی بے وقوف ہیں۔ پہلے تو انھوں نے غلطی کی، پھر غلطی کے ساتھ اندیشوں کو بھی گلے لگائے ہیں۔

اور میں بہت سمجھدار ہوں۔ میں نے ممی پر کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں ان کا راز جان گئی ہوں۔ ویسے اب مجھے ابو پر پیار کم آتا ہے اور بناوٹ زیادہ کرتی ہوں اور ان کے گلے میں ہاتھ ڈالتے وقت تو خاصی کوفت ہوتی ہے۔ لیکن کیا کروں، اب تک ان سے بات منوانے کے لیے یہی طریقہ استعمال کرتی آئی ہوں۔

اور میری یہی چالاکی ہے کہ میں نے آج تک اسے بھی نہیں بتایا کہ میں اس سے بہت قریب ہوں۔ نہ میں بتاؤں گی۔

مرد بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ اگر اسے میری کمزوری کا پتہ چل گیا تو اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں سے بڑھ کر جانے کہاں پہنچ جائیں؟

اگر چہ میرے پاس اندیشوں کی قطعی گنجائش نہیں۔ میں اکثر لوگوں کو فیملی پلاننگ کے اصول بھی بتاتی رہتی ہوں لیکن میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتی۔ ویسے بھی مجھے اپنا فیگر بڑا پیارا ہے۔ اور میں جانتی ہو اس کی ساری محبت کی وجہ میرا جسم ہے اور اس وٹامن کے دور میں جب نو مہینے پر بھی صحت مند بچے نہیں پیدا ہوتے، سات مہینے کا بچہ پیدا ہو کر زندہ رہ جانا بڑا مشکل ہے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ سات مہینے گذریں۔ چھ مہینے بھی تو اندیشوں میں ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

جبھی میں نے اس سے کہا تھا۔ میں کورٹ میرج کیلیے تیار ہوں اس لیے نہیں کہ مجھے خود

پہ کنٹرول نہیں، اس لیے کہ میرا جسم بہت خوبصورت ہے۔ اور آج کل محبت دل سے شروع ہو کر جسم پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے دل سے زیادہ جسم کا خوبصورت ہونا ضروری ہے۔

میرا جسم بہت خوبصورت ہے۔ مجھے ایسا کوئی اندیشہ نہیں کہ وہ مجھے دھوکہ دے گا مگر میں بعد کے اندیشوں میں بھی نہیں پڑنا چاہتی۔

میں نے سوچا تھا کہ جب میں ممی کو اپنی میرج کی خبر سناؤں گی تو شاید ان کے چہرے کی سپیدی اور بڑھ جائے گی۔

یا چند لمحوں کے لیے وہ سرخی پیدا ہو جائے جو کبھی کبھی بہت غصہ میں ہوتی ہے۔

میں نے انھیں بتا دیا کہ میں کل میرج کے لیے جا رہی ہوں۔

''کیوں''؟ ان کا چہرہ اتنا ہی سپید تھا جتنا پہلے۔

''اس لیے کہ میں کوئی ستوانسا بچہ نہیں پیدا کر سکتی''۔

ممی فوراً پلٹ کر چلی گئیں۔ میں جانتی ہوں میرا جواب سخت تھا۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ ممی اور ابوؔ اگر اسے قبول نہیں کر سکتے تو میں بھی اندیشے قبول کرنے پر تیار نہیں۔

عام سی لڑکی

میں نہیں جانتی میں عام سی لڑکی ہوں یا نہیں۔

لیکن جب میں اپنے بارے میں سوچتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ مختلف ہوں۔ کیونکہ میں کبھی بھی عام لڑکی نہ بن سکی۔ آج تک میں اس سے وہ بات نہ کہہ سکی جو وہ ایک لڑکی ہونے کے ناطے مجھ سے سننا چاہتا تھا کہ میں بھی تو آخر لڑکی ہوں۔ اور پھر میں نے اس حقیقت کو تسلیم بھی کرلیا تھا کہ میں صرف لڑکی ہوں اور وہ مجھے صرف لڑکی ہی سمجھتا ہے۔ یہ بات میں نے اپنے آپ سے پانچ سال میں منوائی کہ میں اس بات خوش سے ہوں کہ وہ مجھے لڑکی سمجھتا ہے۔ مگر میں عام لڑکی نہیں بننا چاہتی۔ میں وہ الفاظ اس سے نہیں کہہ سکتی جو وہ مجھ سے سننا چاہتا ہے اور مجھے اپنے آپ سے کہنے میں بھی پانچ سال کا عرصہ لگا ہے۔ اتنے عرصے تک تو کوئی جھوٹ بھی بولا جائے تو سچ بن جاتا ہے۔ اسے خود سب کچھ سمجھ لینا چاہیے تھا۔ میں نے بھی تو اس سے الفاظ کی توقع نہیں رکھی۔ میں عام لڑکی بالکل نہیں۔

''مگر عام لڑکی کیا ہوتی ہے'' وہ دوسری لڑکی مجھ سے پوچھتی ہے۔

''وہی نا! جو نارمل ہوتی ہے؟ تو کیا ابنورمل Abnormal ہونا بڑائی ہے۔ تم خود کو دھوکہ دینا کیوں چاہتی ہو۔ تم تو بڑی ذہین ہو۔ دوسروں کے الفاظ تمہارے لیے ایکسرے پلیٹ کا کام

کرتے ہیں اور خود کو......'' وہ کہتی جاتی ہے۔

''میں خود کو دھوکہ دینا نہیں چاہتی۔ مگر میں کسی خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہتی۔ قدموں کی ہر چاپ جو میری طرف آ رہی ہے میرے لیے ہے، میں ایسا کیوں سوچوں؟''

''تو پھر نظریں اٹھا کر دیکھ لیا کرو کہ قدم کس طرف بڑھ رہے ہیں'' وہ لڑکی سمجھاتی ہے۔

نہیں اگر آنے والا مجھے دیکھ رہا ہو تو کیا سوچے گا۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ کیوں دیکھا ہے؟ میں کمزور نہیں ہوں۔ میں عام لڑکی نہیں بننا چاہتی' ہونہہ عام لڑکی، عام لڑکی۔ لڑکی صرف لڑکی ہوتی ہے۔

اگر تم اتنی مختلف ہو تو آوازیں کیوں سن لیتی ہو۔ قدموں کی چاپ پر چونک کر کیوں سوچتی ہو کہ آنے والا تمہاری طرف آ رہا ہے۔ تمہیں انتظار ہے نا کسی کے آنے کا۔ مگر تم ڈرتی ہو۔ اور جس بات سے ڈرتی ہو پتہ وہ کیا ہے؟'' وہ کہتی ہے۔

''کیا ہے؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''کہیں آنے والا وہ نہیں ہو جس کا تم انتظار کر رہی ہو' وہ بے دردی سے ہنسی۔

''انتظار؟ مجھے تو کسی کا انتظار نہیں۔ مجھے اس کی فرصت بھی کب ہے؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''عدم فرصت بڑا اچھا بہانا ہے۔ تمہیں آوزوں پر سوچنے کی فرصت ہے۔ میں بتاؤں تمہیں کس کا انتظار ہے۔ اس کا' جس نے جاتے وقت تمہیں دیکھا تھا کہ تم شاید اسے روک لو، مگر تم نے اسے نہیں روکا۔ کیوں صحیح ہے نا؟''

''ہاں صحیح ہے۔ لیکن میں انتظار کر رہی تھی کہ وہ کہے گا، میں لوٹ آؤں گا۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں منتظر رہی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔''

''مگر تمہیں یقین ہے کہ وہ لوٹ آئے گا۔ جبھی تو تم آہٹوں کی منتظر رہتی ہو۔''

''نہ آیا بھی تو کیا۔ آج اگر مجھے انتظار ہے تو شاید کل تک بھول جاؤں کہ ایسا تھا۔ کہ میرے پاس کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اور یہ جو میرے گرد اتنے لوگ ہیں مجھے انھیں بھی تو وقت دینا ہے۔ کتنا کم وقت ہے اور اتنے سارے لوگ۔ شاید قدموں کی بے تحاشا آواز میں وہ چاپ بھی کھو جائے۔ اور ابھی تو میں اپنے پیروں کی آہٹ بھی سن لیتی ہوں۔ تم نے دیکھا ہے؟ میں۔ ایک مخصوص انداز میں چلتی ہوں۔ میرے پیروں کی چاپ دوسروں سے کتنی مختلف ہے۔

میں اپنا تعاقب خود کرتی رہوں گی۔ پھر میں خاموش ہو جاتی ہوں۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

یہ مجھے نہیں معلوم۔''

وہ لڑکی مسکراتی ہے۔ خود پرستی۔ انا پرستی۔ خود کو دھوکا دینے کا یہ انداز زیادہ پروقار ہے۔ مگر جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے۔ خدا کرے تم پر اس کا بھرم جلد کھل جائے ورنہ کبھی نہ کھلے۔ تم جو اپنا بت تراش رہی ہو۔ یہ کیوں بھول جاتی ہو اس کے اندر ایک لڑکی بھی ہے جو کسی اور کو سجدہ کرنا چاہتی ہے۔ اپنے سے برتر۔

اس دن سے جب سے تمہیں اس کی برتری کا احساس ہوا ہے تم نے اس سے نگاہیں ملا کر بات کرنی کیوں چھوڑ دی ہے۔

تم شرماتی تو نہیں۔ کہ تمہارا قول ہے شرمائے اس وقت جب کوئی بری بات ذہن میں ہو۔ تو سنو تمہارے ذہن میں بھی بری بات ہے۔ دل کی تو شاید تم قائل ہی نہیں۔''

وہ میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ میں سوچتی ہوں۔ بری باتیں۔ گندی باتیں۔ نہیں میرے ذہن میں تو کوئی گندی بات نہیں۔ لڑکی کہنا کیا چاہتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں ''تمہیں بتادو وہ بری بات کیا ہے جو مجھے شرمندہ کر رہی ہے۔ میں بالکل عام لڑکی نہیں کہ کسی کے متعلق الٹی سیدھی سوچ لے کر بیٹھ جاؤں۔

''وہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ تم سے برتر ہے اور تم اپنی شکست تسلیم کرنا نہیں چاہتیں''

یہ لڑکی صحیح کہہ رہی ہے، کہ وہ مجھ سے برتر ہے۔ مگر یہ غلط ہے کہ میں شکست نہیں تسلیم کرنا چاہتی۔ میں دراصل چاہتی ہوں کہ وہ خود سمجھ لے۔ خود جان لے۔ مگر وہ مجھ سے یہ الفاظ کیوں سننا چاہتا ہے۔ میں عام سی لڑکی بالکل نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو یہ بات بہت دنوں میں سمجھائی ہے۔ پھر میں اسے کیسے بتاؤں۔ یہ میں جو ہر ایک کو خود اپنے بت کے سامنے سجدہ کرتی نظر آتی ہوں میں نے ایک بت اپنی آستین میں چھپا رکھا ہے۔ آخر اس میں اتنی ہمت کیوں نہیں کہ وہ میرا ہاتھ جھٹک دے۔ یا پھر میرا اپنا بت توڑ دے۔ مگر کتنی عجیب بات ہے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے میرا بت لے کر وہاں اپنا مجسمہ رکھ دے گا۔ تبادلہ، سمجھوتہ نہیں، میں کسی سمجھوتے پر راضی نہیں۔ وہ اسے توڑ دے۔ اٹھالے جائے مگر اس نے مانگا کیوں۔ میں اس سے یہ نہیں کہہ سکی۔ میں کبھی بھی نہیں کہوں گی۔ شاید کسی دن کوئی ہوا کا تیز جھونکا آئے

اور یہ بت گر کر ٹوٹ جائے۔ پھر اس میں سے بے شمار چھوٹے چھوٹے مجسمے نکلیں گے۔ جو اس کے ہوں گے۔ کاش وہ خود ہی اسے توڑ دے۔ مگر میں اسے نہیں بتاؤں گی اس کے اندر کیا ہے۔ میرے اندر کیا ہے۔ میں بالکل عام سی لڑکی نہیں۔

چھوٹے بڑے لوگ

بات نہ دل کو سمجھانے کی تھی نہ ذہن کو۔ بلکہ بات یہ تھی کہ وہ بیک وقت دل اور ذہن دونوں پر چھایا جا رہا تھا۔ دراصل ان دنوں میں نے کتابیں چھوڑ کر انسانوں کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اور میرے مسائل بڑھتے چلے گئے تھے۔ اونچے نیچے قد کے لوگوں کے درمیان توازن برقرار رکھنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ تب اس نے کہا تھا میں زیادہ بلندی سے جھانک رہی ہوں۔ انسانوں کی اس بھیڑ کو سمجھنے کے لیے مجھے ان کے درمیان کھڑا ہونا چاہیے۔ میں نے اس پر عمل کرنا چاہا تو اپنے لیے کوئی جگہ منتخب نہ کر پائی۔ اونچے قد والے پنجوں پر کھڑے تھے اور چھوٹے قد والے ان کا مذاق اڑا رہے تھے کہ وہ بڑی تکلیف میں ہیں۔ تب میں نے اسے نسبتاً سکون میں دیکھا تھا۔ اس نے میری سوالیہ نظروں کو بھانپ لیا تھا۔

''تم نے تو بہت سی کتابیں جمع کر لی ہیں۔ ان سے ایک پہاڑ بنالو اور کچھ دیر اس پر کھڑی ہو جاؤ۔ دیکھنا یہ سارے قد والے تمہارے سامنے جھک جائیں گے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر یہ ہوگا کہ تم کب تک پہاڑ پر چڑھی رہوگی۔ ایک دن اتروگی اور تم بھی ان کے برابر پنجوں پر کھڑی ہو جاؤ گی۔''

''نہیں! مجھے ایسی برتری نہیں چاہیے۔''

''یہ بتلاؤ یہ چھوٹے قد والے تو خوش نظر آتے ہیں۔ اگر میں ان کے درمیان آجاؤں؟''

''ہونہہ، یہ خوش نظر آتے ہیں۔'' وہ بولا۔''یہ بیچارے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ان کے حصے کا آکسیجن تو اونچے قد والے جاتے ہیں۔ اور یہ بڑھ نہیں سکتے۔ ورنہ یہ بھی برابر کھڑے نظر آتے۔ ان سب کا المیہ یہ ہے کہ یہ خوش نظر آنے کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔''

اس کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ تبھی میں ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کے متعلق سوچنے لگی۔ اس نے کیسے توازن برقرار رکھا۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی۔ مگر سوال بڑا ذاتی تھا۔ لیکن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ تب وہ بولا۔

''ہاں یہ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ میں بھی کبھی یوں ہی پنجوں پر کھڑا اپنے قد پر نازاں تھا۔ مگر وہ ایک رات تھی جب ہوائیں تیز ہوگئی تھیں۔ مجھے توازن برقرار رکھنا بڑا مشکل نظر آیا۔ تب میں نے جھک کر اپنے ہاتھوں سے زمین کا سہارا لیا۔ اس روز اچانک احساس ہوا کہ بلندیاں صرف اوپر کی جانب نہیں۔ خلا جتنا اوپر کی طرف ہے اتنا ہی ہم نے اپنی ذات میں اتار لیا ہے۔ اگر اسے نکال دیں تو پھر ہم مکمل ہو جائیں گے۔ یہ میرا احساس تھا جو مجھے ان دونوں قسم کے لوگوں سے نکال لایا۔ مگر اب یہ دونوں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

تب میں نے چاہا کہ میں ان دونوں قسم کے لوگوں کو چھوڑ کر اس کے برابر کھڑی ہو جاؤں۔ میں اس کے قریب آگئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے تھام لیا۔ اور پھر اچانک وہ اونچا ہوگیا۔ اتنا اونچا کہ میں خود کو بہت چھوٹا سمجھنے لگی۔ مجھے اس کا جملہ یاد آیا۔ میں نے ہواؤں کی شدت سے گھبرا کر زمین کو تھاما تھا۔ اب دل چاہتا ہے کہ میں خوب ہنسوں اور اس کا مذاق اڑاؤں۔

چھتیس نمبر

مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں کہ میں خوبصورت ہوں، پھر بھی جب کبھی میں آئینہ دیکھتی ہوں تو وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ آئینہ دیکھنا صرف میری عادت ہے، اس میں خود پسندی کا کوئی دخل نہیں۔ خود پسندی تو کیا کبھی کبھی مجھے لڑکی ہونے کا احساس بھی بُرا لگتا ہے۔ کاش میں لڑکا ہوتی، آزادی سے گھومتی پھرتی، دوستوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بات کرتی اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنستی۔ پر اب اگر کوئی مذاق کر کے میری طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو میں یوں ہاتھ کھینچ لیتی ہوں جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ یہ نہیں کہ مجھے ہاتھ ملانے سے گھِن آتی ہے یا میں ایسا کرنا نہیں چاہتی مگر مجھے یقین نہیں ہوتا کہ وہ صرف ہاتھ ملانا چاہتے ہیں۔

دراصل جب سے میں بڑی ہوئی ہوں مجھے عجیب عجیب نظروں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کئی مرتبہ تو ابا کے دوست بھی یوں دیکھتے ہیں جیسے میں کوئی ٹافی ہوں جسے میرا چھوٹا بھائی مزے لے لے کر کھاتا ہے یا پھر میرے اوپر چاکلیٹ کریم کی تہہ چڑھی ہے جو یہ انگلیوں سے اُتار کر چاٹ لیں گے۔

وہ میری سہیلی ہے، جب مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک

ہے کہ میرا قد پانچ فٹ چار انچ ہے جو سینڈل پہن کر پانچ فٹ پانچ انچ ہو جاتا ہے۔ اٹھائیس چھتیس کے فارمولے پر بھی فٹ آتی ہوں مگر میں کسی Beauty Contest کیلیے قطعی موزوں نہیں۔ میری پیدائش پر تو میری نانی کو بڑا صدمہ ہوا تھا کہ ان کے خاندان میں کالی لڑکی کیسے پیدا ہو گئی۔ اپنی گوری چٹی بیٹی کی گود میں مجھے دیکھ کر وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتیں۔ انھیں یہ شبہ تھا کہ میں ہسپتال میں بدل دی گئی ہوں۔ یہ سب باتیں بچپن سے میرے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ پھر بھلا مجھے اپنے خوبصورت ہونے کا یقین کیسے ہوسکتا ہے۔ تب ہی تو میں بار بار آئینہ دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں ایسا کیا ہے جو دوسروں کو میری طرف متوجہ کرتا ہے۔

میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ لوگ میری باتیں سنیں اور سمجھیں اسکول میں میں بہت ذہین طالبہ رہی مطالعہ کے شوق میں ڈھیروں کتابیں پڑھ ڈالیں مگر جب میں لڑکوں سے باتیں کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں سن رہے اور لڑکیاں میری باتیں سمجھ نہیں پاتیں۔ انھیں میری انگلیوں کی بناوٹ اور چلنے کا انداز اچھا لگتا ہے۔ اگر میں انھیں یہ بتاؤں کہ میں نے نہ کبھی ورزش کی ہے نہ قدم اٹھانے کے طریقوں پر غور تو یقین نہیں کریں گے۔ انھیں تو اس بات کا بھی یقین نہیں کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ویسا نہیں جیسا وہ سمجھتی ہیں۔ لڑکوں کو بھی یہی شکایت ہے کہ میں کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں۔ مجھے کیا پڑھنا چاہیے، وہ آنکھیں جن سے مجھے الجھن ہوتی ہے یا وہ خطوط جو کبھی کبھی گمنام میرے پاس آئے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب محلے کے ایک لڑکے نے میرے نوکر سے ایسا خط مجھے بھجوایا تھا تو میں نے بڑا شور مچایا تھا۔ نوکر کو فوراً گھر سے نکالنے کا مطالبہ کیا تھا، تب ممی نے نوکر کو تو نہیں نکالا، مجھ سے کہا کہ میں جب بھی باہر نکلوں دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھوں۔ بھلا دوپٹے کا بے ہودہ خط لکھنے والے سے کیا تعلق ہے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے سے انکار نہیں مگر ان آنکھوں کا کیا کروں جو دوپٹہ تو کیا، کپڑوں کے پار دیکھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ دل چاہتا ہے کسی دن ناخن ان آنکھوں میں اتار دوں۔ پھر سوچتی ہوں کتنی آنکھوں میں۔ بازار سے گزرتے ہوئے جب میں نے کہنی مارنے پر ایک آدمی کی پٹائی کر دی تھی اس وقت کتنی ہی ایسی نظریں کہنی سے بھی زیادہ میرے جسم میں چبھ رہی تھی۔ تب ہی میں نے ایک دن اس سے کہا تھا، ''تم کہتی ہو خوش قسمت ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جن کا جسم خوبصورت ہوتا ہے۔ ذرا ایک دن فوم والا چھتیس نمبر کا بریزیئر پہن کر بازار سے گزر کر دیکھنا۔''

وقت اور فاصلہ

سوچتے سوچتے چونک کر سر جھٹکنا میری عادت ہے۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہوں۔ نہ میں نے کبھی اس کو بتانے کی کوشش کی، مگر وہ ہمیشہ میرے چونکنے پر مسکراتی ہے۔

جیسے اس نے سب کچھ جان لیا ہو۔ مجھے یہ مسکراہٹ بڑی زہر لگتی ہے۔ خواہ مخواہ کی مسکراہٹ۔ بلاوجہ بے وقت۔

کل جب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ کوئی خط آیا ہے، تو وہ نفی میں سر ہلا کر مسکرادی۔ بھلا مسکرانے کی کیا وجہ تھی؟ ضروری نہیں کہ میں نے اس کے خط کے بارے میں پوچھا ہو۔ خط بہت سے آتے رہتے ہیں۔ مگر اس کی مسکراہٹ صاف کہہ رہی تھی کہ تم تو کل سوچ رہی تھیں کہ اب مجھے اس کے خط کی ضرورت نہیں۔ کوئی انتظار نہیں۔ مسکرانا اچھی عادت ہے۔ میرا مذاق وہ نہیں اڑاتی۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی راز داری ہے۔ مگر وہ میرے ذہن میں کس طرح جھانک لیتی ہے۔ کچھ دیر پہلے میں یقیناً اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسی لیے تو خط کے بارے میں پوچھا تھا۔

اس نے بڑے پیار سے مجھے لکھا تھا۔ کہ وہ اس دنیا میں سب سے زیادہ مجھے چاہتا ہے۔

اور اس کی دنیا میرے بغیر نامکمل ہے۔ مگر وہ اپنی طرف سے مجھ پر کوئی پابندی نہیں عائد کرنا چاہتا۔ اس لیے میں جہاں چاہوں شادی کر سکتی ہوں۔

میں سوچتی ہوں۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھوں یا بدقسمت۔ اب اس سے خط کی توقع رکھوں یا نہیں پھر میں عادتاً پوچھ بیٹھی تھی کہ کوئی خط تو نہیں آیا۔

پھر میں سوچنے لگی۔ شاید اس نے یہ سب کچھ میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے لکھا ہو۔ اسے میری خوشی کا بڑا خیال ہے میں نے خود ہی تو اسے لکھا تھا کہ مجھے سطحی جذباتیت پسند نہیں۔ مگر میرا ذہن کہتا ہے جب کسی چیز کی تاویل پیش کرتے ہیں تو خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے سیدھے راستے پر چلتے چلتے راہ بدل دی ہو۔ نہیں میں خود کو دھوکہ نہیں دے رہی یا شائد دے رہی ہوں۔ یہ کش مکش مجھے تھکا دیتی ہے۔ میں چونکتی ہوں۔ سر جھٹکتی ہوں۔ اس کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہ مسکراتی ہے۔ رازداری سے۔ جیسے اسے معلوم ہو کہ اب تک میں نے کیا کیا سوچ لیا ہے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیوں مسکرائی۔ مگر نہیں پوچھتی۔ کہیں اس نے سب کچھ جان ہی نہ لیا ہو۔ میں پھر سوچ میں ڈوب جاتی ہوں۔

وہ لڑکی بڑی قابل رحم ہے۔ بہت پیاسی ہے بے چاری ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالے بیٹھی ہے۔ مگر جب پینے کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہے تو پانی نیچے گر جاتا ہے۔ مجھے بڑا رحم آیا تھا اس پر۔ تبھی میں نے اس سے کہا تھا، ''یہ لڑکے خواہ محبت کہیں بھی کریں، شادی وہیں کرتے ہیں جہاں ان کی منگنی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے سارا دن ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد شام کو گھر لوٹ جاتے ہیں''۔

وہ بڑے رشک سے بولی۔

''تم خوش قسمت ہو کہ تمہارا محبوب تمہارا منگیتر بھی ہے۔'' اور میں جو محرومی سے بالکل ناواقف تھی، اسے صرف جھوٹے الفاظ کا سہارا دے سکتی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ ''فرض کرلو میری اس سے شادی ہوگئی تو کیا ہوگا۔ وہی گھر بار، وہی بچے۔ بستر اور باورچی خانہ کا تعلق۔ مجھے اس کا کوئی شوق نہیں''

جانے اس نے ان الفاظ کا کیا اثر لیا۔ کچھ دیر میری طرف دیکھا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ مگر میں آج تک دوسروں کی سوچ کا اندازہ نہیں لگا سکی ہوں۔

کہنے کو تو میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں۔ مگر جب میرے منگیتر نے جو میرا محبوب بھی ہے

مجھے لکھ بھیجا کہ تم جس سے چاہو شادی کر سکتی ہو۔ میں تم سے دور ہی نہیں بلکہ دوری کا عرصہ بھی طویل ہے۔ جو خیالات میں بہت فرق لا سکتا ہے۔ ہم اگر فاصلے سمیٹ بھی لیں تو وہ وقت کہاں سے لائیں گے جو اس عرصہ میں گزر جائے گا۔ تو مجھے احساس ہوا کہ وہ الفاظ کتنے جھوٹے تھے۔ بستر اور باورچی خانہ کا تعلق بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اسی حیثیت سے کسی اور کو قبول نہیں کر سکتی۔ اب مجھ میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہیں۔ نہیں فرق ہے......اس کا محبوب صرف محبوب ہے جس کی ایک منگیتر بھی ہے۔ تیرا محبوب تیرا منگیتر ہے۔

میرا ذہن کہتا ہے تو پھر خود کو دھوکہ دے رہی ہے۔ نہیں دے رہی۔ یا شاید دے رہی ہے۔

میں چونکتی ہوں۔ سر جھٹکتی ہوں۔ اس کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہ بدستور مسکرا رہی ہے۔

چوتھے کونے کا آسیب

یہ جھوٹے لوگ جو اپنے چہرے پر نئے نام سجا کر سامنے آ جاتے ہیں، میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ ان سے دور رہوں لیکن ہمیشہ یوں لگتا ہے کہ یہ آسیب اپنے روپ بدل بدل کر میرے سامنے آتے رہیں گے۔ میں نے ان سے بچنے کے لیے کئی دعائیں یاد کرلی ہیں مگر جیسے جیسے یہ آسیب سامنے آتے رہے دعاؤں کا اثر کم ہوتا گیا۔ بات یہ ہے کہ میری ماں نے مجھے ہمیشہ چوتھے کونے کی طرف جانے سے روکا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ چوتھے کونے میں میرے لیے کیا کشش تھی۔ مجھے یہ پتہ ہے کہ میں وہ سب کچھ دیکھنا چاہتی تھی جو کچھ اب تک نہیں دیکھا۔ سو میں چل پڑی۔ سفر سمتوں میں کیا جائے یا ایک ہی راستے پر، سفر ہوتا ہے۔ میں نے ایک راستہ پر خود کو ڈال دیا جو میرے خیال میں اسی چوتھے کونے کی طرف جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر بتادوں کہ مجھے قطعی یہ گمان نہیں کہ وہاں کوئی خزانہ ہوگا یا شہزادہ منتظر ہوگا۔ میں تو بس وہ کچھ دیکھنا چاہتی تھی جو میری ماں نے اپنی ماں کے دیئے ہوئے خوف اور اسکی ماں نے اسکی ماں کے دیئے ہوئے خوف کی بنا پر نہیں دیکھا تھا۔ سو میں چل پڑی۔ ایک ایسی سمت جہاں کیا کچھ ہے مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے ماں کا دیا ہوا تعویز گلے میں ڈال لیا اور وہ دعائیں جو مجھے یاد تھیں وہ پڑھ لیں۔ لیکن پھر بھی کئی آسیب میرے سامنے آئے۔ پہلا آسیب جو نظر آیا تھا اسے اس وقت

تک میں نے آسیب نہیں جانا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بھی اسی سمت جا رہا ہے جدھر میں۔ سو میں اسے ساتھ چلنے کی اجازت دے دوں، میں نے اس سے کہا کہ میں اسے اپنے زادِ راہ میں شریک نہیں کروں گی۔ وہ مان گیا اور چل پڑا لیکن کچھ دور چل کر اس نے سفر کو سست بنانا شروع کر دیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اور کبھی کبھی غلط سمتوں پر مڑ جاتا۔ مجھے بڑی جھنجلاہٹ ہوئی۔ ایک دن میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ کوئی دوسرا ہم سفر ڈھونڈ لے میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تو وہ میری منتیں کرنے لگا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا بوجھ کم کر لے تو اس کے لیے سفر آسان ہو جائے گا لیکن وہ یہ کرنے پر آمادہ نظر نہیں آیا تو میں تیز تیز قدم بڑھاتی آگے نکل آئی۔ کچھ دور سے جب میں نے اسے مڑ کر دیکھا تو وہ سخت غصہ میں تھا۔ اور اس کی شکل بالکل بدلی ہوئی تھی۔ بھیانک بگڑی ہوئی۔ تب مجھے بڑا خوف آیا اور میں بھاگ کھڑی ہوئی۔

دوسرا آسیب جو مجھے ملا وہ اس وقت جب میں ایک پتھر پر آرام کرنے بیٹھی تھی۔ دھوپ بہت سخت تھی۔ تب وہ مجھے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا نظر آیا۔ اس نے کہا کہ میں بھی سائے میں آ جاؤں۔ میں اس کی اسی مہربان پیشکش پر شکر گزار ہوئی اور پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے میرے سفر کی سمت پوچھی تو میں نے اسے بتا دی۔ وہ کہنے لگا کہ وہ اسی جانب سے آ رہا ہے اگر میں پسند کروں تو وہ اس راستہ پر میری راہنمائی کر دے گا۔ وہ مجھے بڑا مہربان لگا تو میں نے اس کے ساتھ کو اچھا جانا اور اور چل پڑی۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میرے پاس اس مہربانی کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ چاہے تو میرے زادِ راہ میں شریک ہو سکتا ہے اس نے کہا کہ وہ یہ سب کچھ کسی معاوضہ کے لیے نہیں کر رہا ہے۔ تب میں نے ایک دن اس کی مہربانیوں کے صلہ میں اپنے گلے میں پڑا ہوا تعویز اُتار کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ میرے پاس سب سے قیمتی چیز تھی جو میں اسے پیش کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ اس نے غصہ میں کہا کہ یہ پیشکش اس کی توقع سے بہت کم ہے۔ اور میرے پاس سب سے زیادہ قیمتی چیز خود میری ذات ہے۔ میں نے تعویز پھر گلے میں ڈال لیا۔ اور یہ کہہ کر آگے بڑھ آئی کہ میں نے اس سے معاوضہ کے سلسلہ میں پہلے ہی معذرت کر لی تھی۔ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ اتنا ہی بھیانک ہو رہا تھا جتنا پہلے والا۔

تیسری مرتبہ وہ مجھے ایک فقیر کے روپ میں ملا۔ میں اسے ایک بزرگ فقیر سمجھ کر اسکی

باتیں سننے پر آمادہ ہوگئی۔ وہ میرے ساتھ بڑھتا رہا اور بولتا رہا کہ جو راہ میں نے اپنائی ہے وہ بہت مشکل ہے۔ راستے کی یہ مشکل اس کی دعاؤں اور ان مشوروں سے آسان ہوسکتی ہے جو اس نے اپنی گذشتہ زندگی کے تجربوں سے حاصل کئے ہیں میں نے کسی حد تک اس کو سچا جانا۔ اس نے کچھ دور چلنے کے بعد کہا کہ اگر آگے بڑھنا ہے تو میں ماضی سے رشتہ بالکل توڑلوں۔ کہ یہ بہت مشکل ہے کہ ہم بیک وقت آگے اور پیچھے دونوں طرف سفر کریں۔ اور اس کے لیے مجھے سب سے پہلے اپنا تعویز اتار دینا چاہیے جو میرے ماضی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس تعویز کے بدلے میں وہ مجھے ایک ایسا تعویز دے گا جو مجھے سارے خوف سے دور کر دے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا تعویز بھی پہلے تعویز کے ساتھ پرو دے تو کیا حرج ہے۔ وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا اور اس نے میری ضد کو بچکانہ کہنا شروع کیا۔ میں اپنے ماضی کے تجربوں کی بنا پر تعویز کو خود سے الگ نہیں کر چاہتی تھی۔ تب میں نے اسے کہا کہ میں یہ تعویز اس شرط پر اتاردوں گی کہ وہ میرا تعویز امانت کے طور پر رکھ لے۔ اور جب بھی مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو تو وہ مجھے واپس کر دے۔ اس نے سامنے دریا کی طرف اشارہ کیا کہ میں اپنا تعویز اس میں ڈال دوں۔ میں نے تعویز اس کے گلے میں ڈالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ فوراً خفا ہو کر پیچھے کی جانب بھاگا۔

اس کی شکل بے حد بگڑی ہوئی تھی۔ بالکل آسیب کی طرح۔ تب سے یہ آسیب کئی مرتبہ مجھ سے ٹکرایا۔ میں سوچتی ہوں اب اپنا سفر روک کر واپس مڑ جاؤں اور اپنی بعد والی نسل کو یہ کہانیاں سنا سنا کر چوتھے کونے کی طرف بڑھنے سے روکوں۔

سفر میں

''میں سفر میں بہت دور سے چل کر آ رہی ہوں۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے بستر پر لیٹنے دو گی''۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''اس بستر نے مجھے کب آرام دیا ہے کہ تم تھکن دور کر لو گی۔ مگر تم لیٹ جاؤ تمہاری خواہش پوری ہونی چاہیے۔ بتاؤ تم اتنی تھک کیسے گئیں؟''

''میں بہت دنوں سے چل رہی ہوں۔ پتہ نہیں کب سے؟ بغیر رکے۔ بغیر سوچے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ مجھے جانا کہاں ہے؟ میں کیوں چل رہی ہوں؟ کہاں تک جاؤں گی اور وہاں کیا ملے گا؟ میں چلتی رہی وقت اور لمحوں کا احساس کئے بغیر۔ میں نہیں جانتی ان دنوں میں نے کیا کھویا، کیا پایا۔ دراصل میں ان سب احساسات سے دور تھی اور مطمئن بھی۔ پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں بہت چل چکی ہوں۔ اور اب مجھے مزید نہیں چلنا چاہیے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

''کیا تم بتاؤ گی تمہیں یہ احساس کیسے ہوا؟''

''ہاں۔ یہ احساس یہ بھی ایک کہانی ہے''۔

''ایسا ہوا کہ ایک روز مجھے راستے میں وہ مل گیا''۔

''وہ کون؟''

''وہ بھی میری طرح ایک راہگیر تھا۔ وہ کچھ دور تک میرے ساتھ چلتا رہا۔ ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ بس ایسی ہی بے مقصد باتیں۔ وقت گزارنے کی باتیں۔ اسے میری باتیں اچھی لگتی تھی اور مجھے اس کے سننے کا انداز۔ وہ مجھ سے سوالات کرتا تم کہاں جارہی ہو۔ کیوں جارہی ہو۔ اگر تم یہاں رک جاؤ تو کیا ہو۔ اور اگر آگے بڑھیں تو تمہیں کیا ملے گا۔ میں اس کا کیا جواب دیتی تھی مجھے یاد نہیں۔ بس مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔

پھر وہ موڑ آ گیا جہاں اسے ٹھہر جانا تھا اور میں آگے بڑھ گئی۔ اس نے آخری سوال پوچھا تھا کہ کیا تم اکیلے آگے جا سکو گی؟ میں نے کہا تھا کہ ابھی تک میں اکیلی ہی چلتی رہی ہوں۔ وہ ٹھہر گیا۔ میں آگے بڑھ آئی۔ اس کے بعد سے یہ سوالات میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ تھکن کا یہ احساس بھی اس کے بعد ہی پیدا ہوا۔ اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''تمہیں اس طرح آرام نہیں ملے گا۔ تم واپس چلی جاؤ، وہاں جہاں اسے چھوڑ کر آئی ہو۔ پھر تم مطمئن ہو جاؤ گی۔''

''میں نے یہ بھی سوچا ہے اگر چہ میں نے واپسی کا سفر کبھی نہیں کیا۔ مگر میں اس کے لیے یہ بھی کر لیتی''۔

''تو تم کیوں نہیں لوٹ رہی ہو۔ تم لوٹ جاؤ''۔

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ وہاں نہیں ہوگا۔ مجھے پتہ ہے وہ وہاں نہیں ہوگا۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں نے اسے چلنا سکھا دیا ہے۔ سفر کرنا سکھا دیا ہے۔ وہ کسی اور راستے پر آگے بڑھ گیا ہوگا۔ مجھے کچھ دیر لیٹ جانے دو''۔

وہ میرے بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ مگر وہ سوئی نہیں۔ کچھ دیر کے بعد بولی۔

''سنو، جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ میں مرگئی ہوں۔ بتاؤ کیا میں زندہ ہوں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ ایک مرتبہ مجھے بھی ایسا ہی احساس ہوا تھا''۔

''کیسے؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''بس یوں لگا جیسے میں زندہ نہیں ہوں۔ میں مرچکی ہوں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا

کہ میں زندہ ہوں مگر چونکہ غلط جگہ پر تھی اس لیے زندگی کا ہر احساس مجھ سے دور چلا گیا تھا''۔

''کیوں؟''

''دراصل وہ آنکھیں دور تھیں جن میں، میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔ ان آنکھوں کے ساتھ میرا وجود بھی مجھ سے چھن گیا تھا''۔

''پھر؟''

''پھر کچھ دنوں کے بعد اس جیسی بے شمار آنکھوں نے مجھے میرے جسم کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ جسم جس سے میں بالکل بے خبر ہو چکی تھی۔ اور پھر میں آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔ مگر اپنے وجود کے لیے نہیں۔ اپنے جسم کے تحفظ کے لیے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ مردہ بدن پر چیل اور گدھ آتے ہیں مگر وہ لوگ ان سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔ میں ڈر گئی اور ایسے گوشے تلاش کرنے لگی جہاں اپنے جسم کو چھپا سکوں مگر تنہائیوں میں رات اور طوفان بہت خوفناک بن جاتے ہیں۔ مجھے پھر بستیوں کی طرف لوٹنا پڑا''۔

''جب تم آنکھوں ہی میں رہنے کی عادی تھیں تو ان میں سے کسی کا انتخاب کر لیتیں''۔ اس نے کہا۔

''انتخاب۔ ان آنکھوں کا جن سے مجھے کبھی تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ چیلیں میرا بدن نوچ لیتیں گدھ مجھے کھا جاتے۔ میں بہت شدت سے بھاگی ہوں، تیزی سے۔ اب یہاں اسی بستر پر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ تم چاہو تو کچھ روز میرے ساتھ رہ لو۔ مگر تمہیں آرام نہیں ملے گا، سکون نہیں ملے گا''۔

''یہ سکون ہمیں کیوں نہیں ملتا۔ ہم آخر کیا چاہتے ہیں؟''

''میں کیا چاہتی ہوں، میں بھی اکثر سوچتی ہوں۔ مگر مجھے آج تک اس کا جواب نہیں ملا۔ اور سکون، وہ تو اس دن چھن جاتا ہے جب ہم یہ سوچنا شروع کرتے ہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تو بتاؤ ہم کیسے جیئیں۔ کہاں جیئیں''

''خوابوں میں۔ ہمیں خواب دیکھنا چاہیے''۔

''اس کے لیے نیند کی ضرورت ہوگی۔ مجھے سو جانا چاہیے''۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر وہ سو نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں اس بستر پر نیند نہیں آتی۔ اور اگر وہ سو بھی گئی تو خواب میں خود کو چلتے ہوئے دیکھے گی۔ تنہا چلتے ہوئے۔ مگر مجھے یہ سب

کیسے معلوم ہوا میں نے تو ایک عرصہ سے خواب نہیں دیکھا۔ میں سوئی بھی نہیں۔ میں نے اکثر سوچا کہ ان لوگوں سے وہ دوا مانگوں جسے کھا کر سنا ہے وہ خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق خواب۔ مگر اسے کھا کر وہ گدھ اور چیل بھی بن جاتے ہیں۔ کتے بلّی اور گیدڑ بھی۔ اور ان کی آنکھیں۔ میں اپنے لیے ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے اسی لیے وہ دوا نہیں مانگی۔ میں ان میں شامل نہیں ہونا چاہتی۔ میں مری نہیں ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ یہ لڑکی بھی زندہ ہے۔ مگر ہم اپنے وجود کا جواز ڈھونڈنے میں ناکام ہیں۔

جھوٹے پھل

رات گہری ہو جاتی ہے تو میرا وجود بھی تاریکی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔لیکن جانے کیسے میں اس اندھیرے میں بھی خود کو دیکھ لیتی ہوں۔

اس لمحہ میں میں وہ نہیں رہتی جو دن کی روشنی میں ہوں۔ تب میں اپنے بدلے ہوئے وجود سے کتنے ہی سوال کرتی ہوں۔ اپنے متعلق، دوسرں کے متعلق۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسی کے دیئے ہوئے اکثر جواب دن کی روشنی میں میرے لیے قابل قبول نہیں ہوتے ہیں۔ نہ صرف اپنے متعلق تمام خیالات رد کر دیتی ہوں بلکہ دوسروں سے تعلق رکھنے والی باتیں بھی جھوٹی نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ اس نے بتایا ہے کہ ہم دوسروں کی شناخت بھی اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ بالکل یوں ہی جیسے آئینہ دیکھ رہے ہوں۔ اور جب چہرہ بھیانک نظر آئے تو کہہ دیں کہ یہ ہمارا چہرہ نہیں۔ پتہ نہیں میرا کون سا وجود سچا ہے؟

اس دن، دن کی روشنی میں وہ کہہ رہا تھا ''درختوں میں جب پھل لگ جاتے ہیں تو ان کی شاخیں خود بخود جھک جاتی ہیں۔ مگر بعض درخت اتنے اونچے ہوتے ہیں کہ ان کے پھل بھی ہاتھ نہیں آتے۔''

''اور پھر تم انہیں کھٹے ہیں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہو۔

مگر رات کو میں سوچ رہی تھی کہ وہ درخت پر چڑھنا بھی سیکھ سکتا ہے لیکن اس لیے نہیں سیکھتا کہ سکھانے والا کہیں پہلا پھل خود نہ چکھ لے۔

میرا دوسرا وجود زیادہ سچا ہے۔ مگر میں زیادہ تر لوگوں سے دن کی روشنی میں ملتی ہوں اور رات کی باتیں بھلا کر ملتی ہوں۔ جب میں خود انھیں قبول نہیں کر سکتی تو بھلا یہ لوگ کیسے قبول کریں گے۔

کل وہ دونوں لڑکیاں ایک پیڑ کے نیچے لڑ رہی تھی۔ پیڑ پھل دار ہے اور اس کی شاخیں ایک لڑکی پر جھک آئی ہیں۔ مگر دوسری لڑکی کے ہاتھ بھی پھلوں تک پہنچ رہے ہیں۔ دونوں لڑکیاں بڑی پیاسی ہیں اور پھلوں کے رس سے پیاس بجھانا چاہتی ہیں۔ پہلی لڑکی جھکی ہوئی شاخوں اور پھلوں کو اپنا حق سمجھ رہی ہے اور دوسری لڑکی کی مداخلت نہیں پسند کرتی۔ دوسری لڑکی کہہ رہی تھی کہ وہ پیاسی نہیں صرف سائے کے لیے یہاں کھڑی ہے۔ تب میں نے کہا تھا کہ جب ہوا چلے گی تو یہ پکے ہوئے پھل گر کر پھٹ جائیں گے اور تمہارے کپڑے پر ان کے دھبے لگ جائیں گے۔ تب تمہیں افسوس ہوگا۔ تم سائے کے لیے کوئی گھنا پھولوں والا پیڑ تلاش کرو۔ مگر پہلے یقین کر لو کہ تم پیاسی تو نہیں۔

جانے اس لڑکی نے میرے مشورے پر عمل کیا یا نہیں، مگر رات کو میرا دوسرا وجود کہہ رہا تھا کہ پیاسی تو دراصل دونوں ہیں مگر انہیں یقین نہیں کہ اس پیڑ کے پھل ان کی پیاس بجھا بھی سکیں گے۔

میں نے اکثر اسے جھوٹا ٹھہرانے کی کوشش کی مگر وہ کہتا ہے کہ جن باتوں کو ہم رد کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں وہ زیادہ سچی ہوتی ہیں۔

بدلتی ہوئی جون

یہ لوگ، اتنے سارے لوگ، یہ سب لوگ مجھے تھکا دیتے ہیں۔ میں ان کے چہرے دیکھ دیکھ کر، ان کی آوازیں سن سن کر تھک گئی ہوں۔ مگر میں یہاں کیوں بیٹھی ہوں......؟

کیا اس لیے کہ میں اب مزید چل نہیں سکتی۔ یا اس لیے کہ جو جال بن دیا گیا ہے اسے اب توڑنا میرے بس میں نہیں۔ اگر میں ان دونوں میں سے کوئی بات بھی قبول کرلوں تو میری شکست ہوگی...... مسئلہ یہ ہے کہ میں پیچھے کی طرف بھی نہیں جاسکتی۔ ایسے میں اگر میں ان چیزوں کے علاوہ کچھ دیکھنا چاہوں تو صرف میرا اپنا چہرہ ہے کوئی اور آواز سننا چاہوں تو صرف میری آواز ہے۔ اپنا چہرہ دیکھ کر بھی کیا فائدہ۔ اس پر بھی تھکن کے آثار ہیں...... میں نے جھنجھلا کر اپنا چہرہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے، اپنی آواز کو دوسروں کی آواز میں گم کردیا ہے، کیونکہ یہ صرف ایک سوال بن گئی ہے، تو یہاں کیوں بیٹھی ہے۔

میں یہاں کیوں بیٹھی ہوں، ان بہت سارے لوگوں سے میرا کیا ناطہ ہے یہ سانپ جو ایک دوسرے کو ڈسنے کی کوشش میں ہیں۔ میں کیوں ان سانپوں کے کھیل میں محو ہوکر خود کو نظر انداز کرنے کی کشش کررہی ہوں۔ کیا میری جون بھی تبدیل ہورہی ہے۔ میں نے ان لوگوں سے سنا ہے کہ انھیں سانپ بننے میں ایک طویل عرصہ لگا ہے وہ اس کا احساب برسوں میں کرتے

ہیں۔ اور میں نے ابھی یہاں برس نہیں گزارے مگر برس تو گزر ہی جائیں گے اور میری جون بھی تبدیل ہو جائے گی۔ پھر میں بھی انھیں کی طرح اس بھیانک کھیل کا حصہ بن جاؤں گی۔ جہاں بڑے اژدھے چھوٹے اژدھوں کو اور چھوٹے اژدھے سانپوں کو نگلتے رہنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور جو نگل نہیں سکتے وہ ڈسنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے۔ میں آئینہ اٹھاتی ہوں کہیں سچ مچ میری جون تو تبدیل نہیں ہو رہی۔ مگر مجھے آئینے میں صرف اپنا تھکا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ تھکن آنکھوں میں یوں سمٹی ہوئی ہے جیسے وہ اس کھیل سے نالاں ہوں...... میں قلم اٹھاتی ہوں خود کو مصروف کرنے کے لیے۔ پہلے جب میں لکھتی نہ تھی تو تصویریں بناتی تھی، پھولوں کی، پرندوں کی، میں کاغذ پر تصویریں بناتی ہوں۔ ایک سانپ دوسرے سانپ کو ڈس رہا ہے یہ کیا......؟ میں اپنی انگلیوں کی طرف دیکھتی ہوں کہیں وہ سانپ تو نہیں بن گئیں۔ کبھی یہ انگلیاں بہت خوبصورت ہوا کرتی تھیں اور انھیں دیکھ کر مجھے اپنے آرٹسٹ ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن اب تو شاید میری جون بدل رہی ہے میں خوفزدہ ہو کر قلم رکھ دیتی ہوں اور پھر آئینہ دیکھنے لگتی ہوں، آنکھوں کی تھکن اور بڑھ جاتی ہے۔ سو جانا چاہیے۔ میں آنکھ بند کر کے لیٹ جاتی ہوں...... میں دیکھتی ہوں میرا جسم ایک سانپ کے جسم میں تبدیل ہو رہا ہے۔ سیاہ اور چمکتا ہوا سانپ، میں اپنے گرد کسی کو برداشت نہیں کر سکتی، مجھ میں بے پناہ قوت آ گئی ہے۔ میں سارے وجود ختم کر دوں گی۔ میرے اندر بہت تیز آگ بھڑک رہی ہے۔ میں سب کو اس آگ میں جلا دوں گی۔ اب میرے گرد کوئی نہیں ہوگا۔ میں اپنے بھڑکتے ہوئے وجود کے ساتھ آگے بڑھنے لگتی ہوں......تب ہی مجھے پیاس محسوس ہوتی ہے...... میں، مگر میری پیاس کسی گرم وجود سے ہی بجھ سکے گی۔ میں کسی گرم بدن کی تلاش میں چل پڑتی ہوں جس کو ڈس کر اپنی پیاس بجھا سکوں۔

میں جہاں پہنچتی ہوں وہ راستہ میرا جانا پہچانا ہے۔ یہاں سے میں اکثر گزری ہوں۔ سامنے کا راستہ مجھے نظر نہیں آتا پھر بھی میں نے اس کمرے کا راستہ تلاش کر لیا، میں آگے بڑھتی ہوں۔ اس کے بستر کے قریب پہنچ کر میں اس کے ہونٹوں پر اپنی زبان رکھتی ہوں اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں چونک کر اپنے آپ کو ٹٹولتی ہوں، کہیں میں واقعی تبدیل تو نہیں ہو گئی...... کیا میں پاگل ہو گئی ہوں، یہ سارے لوگ مل کر مجھے پاگل بنا دیں گے...... مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ مگر سامنے خار دار جال ہے اور پیچھے اژدھے، دائیں بائیں کسی طرف کوئی راستہ نہیں۔ میں پھر بھی بڑھتی جاتی ہوں، گھسٹتے ہوئے وجود کے ساتھ، شاید کسی دن کوئی راستہ مل

جائے اسی طرح کچھ دن اور گزر جائیں گے۔ یہ اژدھے میرے وجود کے عادی ہو جائیں گے، وہ بھی منتظر ہیں کسی دن میں ان کی اچھی شریک بن جاؤں گی۔ ایک دن میں بڑی ہمت کر کے ایک بڑے اژدھے سے پوچھتی ہوں کہ ''کیا تم اس جال کو پار کر سکتے ہو؟''

''......ہاں، کیوں نہیں...... اگر احتیاط سے چلوں تو۔'' ''میں اسے عبور نہیں کر سکتی'' میں اس سے کہتی ہوں۔ ''مگر تم اسے کیوں پار کرنا چاہتی ہو'' وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ ''اس لیے کہ میں ان سب سے اکتا گئی ہوں۔ میں اب انہیں دیکھنا نہیں چاہتی'' میں دوسرے سانپوں کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہوں۔ ''برے تو یہ مجھے بھی لگتے ہیں میرا بس چلے تو میں ان سب کو نگل جاؤں اور پھر یہاں تنہا رقص کروں۔'' وہ میرے طرف دیکھے بغیر کہتا ہے۔ ''تو چلو دوسری طرف چل کر رقص کریں'' اس نے پھر کہا...... اژدھے کی پیٹھ پر بیٹھ کر میں اس جال کو عبور کر جاؤں گی، میں سوچتی ہوں اور وہ اس پر رضا مند ہو جاتا ہے۔ اگر چہ اژدھے کی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کرنا خطرناک تھا لیکن میں نے ایسا ہی کیا اور جب ہم بستی میں پہنچے تو ساری بستی خوفزدہ ہو کر بھاگ گئی۔ تعجب تو یہ تھا کہ لوگ اژدھے کے ساتھ مجھ سے بھی خوفزدہ تھے......اور میں پھر تنہا تھی، اپنے تنہا وجود اور ایک اژدھے کے ساتھ......

تلاش

زندگی ایک مسلسل تلاش بن کر رہ گئی ہے۔ پتہ نہیں ہم نے کیا کھویا ہے جو ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔ کبھی اپنی ذات میں کبھی دوسرے کی۔ تم نے کبھی محسوس کیا ہے؟''

وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں۔ شاید'' میں نے سر ہلایا۔

''تم نے ضرور محسوس کیا ہوگا۔ تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں کہ تم بھی کچھ ڈھونڈتی رہتی ہو۔ اور انہیں دیکھ کر میرا یہ احساس بہت شدید ہو جاتا ہے کہ ہم کچھ کھو چکے ہیں۔ کیا تم بتاؤ گی کہ تمہاری آنکھوں میں کسی کی تلاش ہے؟''

وہ مجھ سے میری باتیں کر رہی ہے۔ میری ذات کے بارے میں۔ مجھے اس کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ میں نے جواب نہیں دیا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔

''میرے پاس کچھ ڈھونڈنے کا جواز ہے۔ میں بہت کچھ کھو چکی ہوں۔ اپنی عمر کا ایک طویل عرصہ اور اب کچھ پانا چاہتی ہوں۔ مگر میں نے کیا کھویا ہے اور میں کیا چاہتی ہوں، مجھے اب تک نہیں معلوم ہو سکا۔ میں دوسروں کے چہرے سے اندازہ لگانا چاہتی ہوں کہ وہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔ انھیں کیا چاہیے۔ مگر میں اس میں بھی کامیاب نہیں۔ بتاؤ تم کیا ڈھونڈتی ہو۔ شاید تم

میرے طرح اندھیرے میں نہ بھٹک رہی ہو۔''

وہ میری ذات میں اپنا وجود ڈھونڈ رہی ہے۔ کوئی بھی دوسرے کی ذات پر زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اور جو یہ باتیں کرتا ہے وہ صرف یہ جاننے کو کہ اس کے وجود میں وہ خود کس حد تک مشترک ہے۔ وہ مجھے آئینہ بنا کر خود کو دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر میں کیا کہوں۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کیا ڈھونڈ رہی ہوں۔

میرے سامنے لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ کتنے ہی چہرے ہیں۔ کچھ چہرے مانوس ہو کر بھی اجنبی ہیں اور کچھ ایسے اجنبی جن سے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ میں یہ بات اسی لڑکی کو بتا بھی دوں تو نئی نہ ہوگی۔ یہ تو اس نے بھی محسوس کیا ہوگا میری نگاہیں ان چہروں سے کچھ کہانیاں ضرور لے آتی ہیں۔ اور میں سوچتی ہوں کہ وہ کہانی جو میں نے ان چہروں پر پڑھی ہے میری اپنی تو نہیں، ایک ایسی داستان جو میں اپنی ذات سے منسوب نہیں کرنا چاہتی۔

یہ لڑکی جو کچھ ڈھونڈ رہی ہے اسے پانا نہیں چاہتی بلکہ یہ بھی نہیں جاننا چاہتی کہ جس کے وجود سے وہ بیزاری کا اظہار کرتی رہتی ہے وہی اس کی تلاش ہے۔ میں اگر اسے بتا دوں کہ تم اسے ڈھونڈ رہی ہو جس نے تم سے کہا تھا کل تم میرے خوابوں میں آئی تھیں اور مجھے چھو کر چلی گئی۔ تمہارا لمس میرے پاس امانت رہ گیا۔ میں اسے لوٹانا چاہتا ہوں اس بات پر وہ بہت ہنسی تھی۔

میں یہ بات اسے یاد دلا دوں تو وہ پھر ہنسنے لگے گی۔ لیکن میں اسے یہ نہیں کہوں گی میں اسے صرف یہ بتا دوں گی کہ میرے پاس بھی کوئی ایک امانت چھوڑ گیا ہے۔ اگر مل گیا تو لوٹا دوں گی۔

وہ لڑکا جس نے اسے اپنا خواب سنایا تھا، میری آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا، ''تمہاری آنکھیں آج مجھے بہت مانوس لگ رہی ہیں۔ کیا تم نے بھی کوئی خواب دیکھا تھا۔'' ہاں مگر میں نے اپنا خواب کسی کو نہیں سنایا۔ شاید میں تم کو بتاتی کہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ پر تم چلے جاؤ۔ کہیں مجھے کچھ یاد نہ آجائے۔'' میں اس سے دور ہٹ گئی تھی مگر اس کی آواز سنی تھی۔

''تم پہلی لڑکی نہیں ہو جو جھوٹ بول رہی ہو۔ میں ایک ایسی لڑکی تلاش کروں گا جو سچ بولتی ہو۔''

لڑکی سامنے بیٹھی میرے جواب کی منتظر ہے۔ میں اس سے پوچھتی ہوں:

''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم زندہ ہو۔''

''ہاں''

''کیسے''؟

''اس لیے کہ میں محسوس کرتی ہوں، بہت کچھ محسوس کرتی ہوں۔ اس کے الفاظ بھی۔ تمہاری آنکھیں بھی۔ اور اپنی ذات کو بھی۔ احساس کا یہ کرب میری زندگی کا ثبوت ہے میں اس سے بچنا چاہتی ہوں'' وہ چپ ہو جاتی ہے۔

ہاں وہ اپنی موت نہیں چاہتی۔ میں اپنی موت نہیں۔ ہم سب اپنی زندگی کا جواز تلاش کر رہے ہیں۔

یہ لڑکی جو میرے پاس اتنی دیر سے بیٹھی ہے۔ صرف یہ سننا چاہتی تھی کہ اس لڑکے نے میری آنکھوں میں جھانک کر کیا پوچھا تھا۔ وہ بھی صرف جاننا چاہتا تھا کہ کیا لڑکیاں بھی ایسا خواب دیکھ سکتی ہیں۔ مگر میں یہ نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ وہ ان باتوں کو قبول نہیں کر سکیں گے۔

زمین کی حکایت

شہر کے لوگوں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں تھی اور جن کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ بھی نظریں چار کرنے سے کترا رہے تھے۔ ایسے میں زبانیں بھی بند تھیں انہیں ڈر تھا اگر وہ کچھ بولے تو اسے آنکھوں کا دیکھا نہ سمجھا جائے۔ البتہ کان سب کے کھلے تھے اور شہر کے حاکم کی طرف سے اعلان تھا کہ جو کچھ اس کی طرف سے کہا جا رہا ہے وہ ضرور سنا جائے۔ پھر ان کے پاس سننے کے سوا کچھ رہا بھی نہیں تھا۔ شہر کے حاکم کی طرف سے کچھ لوگ مقرر کر دیے گئے تھے جو مسلسل کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ جن کی اکثر باتیں شہر کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی نہیں۔ مگر شہر کے حاکم نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جو باتیں سمجھ میں نہیں آتیں وہ ضرور سنی جائیں کہ یہ سب کچھ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ آنکھوں اور زبانوں کی طرح کانوں کو بھی اسی قابل بنا دیا جائے کہ وہ سن کر بھی نہ سن سکیں۔

پر شہر میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ان باتوں کو سننے کے بجائے اسی عورت کے گرد بیٹھا رہتا تھا جو اپنے خواب بیان کرتی تھی۔ اس سے پہلے اس کے گرد لوگوں کا اتنا ہجوم نہیں تھا کہ لوگوں کے پاس سننے کو بہت کچھ تھا۔ تب وہ لوگ آپس میں بہت کچھ بولتے اور سنتے رہتے تھے۔ اس وقت انھیں یہ عورت پاگل نظر آتی تھی جو صرف خواب دیکھتی تھی اور خواب بیان کرتی

رہتی۔ بھلا دوسروں کو اس کے خوابوں سے کیا دلچسپی پر اب اُن کو اس کی باتیں بہت اچھی معلوم ہونے لگیں تھیں۔ کیونکہ وہ خواب کی باتیں کرتی تھی اور خواب کی کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آجاتی تھیں، چنانچہ اب وہ حاکم کے لوگوں کو سننے کے بجائے خاموشی سے اس عورت کے گرد بیٹھے اس کے خواب سنتے رہے تھے۔ وہ عورت مسلسل بولتی رہتی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ایسی زمین پر پہنچ گئی جہاں سب کے قد برابر ہیں۔ اور ان کا کھانا پینا بھی برابر ہے۔ ان کے یہاں جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں وہ برابر کی خوراک پاتے ہیں۔ تب ہی ان کے قد برابر ہوجاتے ہیں۔ جب ان کے یہاں کوئی ایسا آجاتا ہے جس کا قد ان کے برابر نہ ہوتو وہ شناخت کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ جب میں وہاں پہنچی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم ہم میں سے نہیں اس لیے یہاں سے چلی جاؤ۔ پھر میں وہاں سے چلی آئی۔ اس کے بعد کا حصہ میں نہیں سناؤں گی کہ وہ یہاں کی زمین سے متعلق ہے۔ اب میں دوسرا خواب سناتی ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ تم لوگ جو اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہو تم خود خواب کیوں نہیں دیکھنا شروع کردیتے۔ آخر جو چیز ہمارے پاس ہے اس کا استعمال بھی ہونا چاہیے۔ اس عورت نے پہلی مرتبہ ان کی ذات سے متعلق بات کی تھی۔

ہم نے کوشش کی لیکن ہمیں خواب بھی نہیں نظر آئے......"

ان میں سے کئی نے جواب دیا۔

"نہیں نظر آتے پھر بھی دیکھو" اس عورت نے کہا۔

"کیسے؟"

ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

وہ اس طرح کہ تم دوسروں سے کہنا شروع کردو کہ میں نے یہ دیکھا کہ...... مثلاً میں ایک راستہ پر چلا جارہا ہوں بالکل تنہا...... بہت لمبا اور مشکل راستہ ہے۔ میرے پیر زخمی ہوگئے۔ پھر میں ایک چوراہے پر پہنچا تو کچھ لوگ میری طرف بڑھے اور میرے پیچھے چلنے لگے۔ میں نے ان کی پرواہ نہیں کی بس خاموشی سے بڑھتا رہا۔ لوگ میرے پیچھے آتے رہے۔ ہر موڑ پر کچھ لوگ آکر شامل ہوتے رہے۔ میں نے سنا کہ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس راستے کی ہمیں برسوں سے تلاش تھی۔ یہ شخص ہمیں یہاں تک لے آیا ہے تو اب آگے بھی لے جائے گا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم بھٹکتے رہتے۔"

''پر جب ہم نے یہ نہیں دیکھا تو بولیں کیسے؟ مجمع میں سے ایک نے سوال کیا۔''بولو کہ تمہارے پاس زبان ہے اور اس کا بھی استعمال ہونا چاہیے'' وہ بولی۔

لوگ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم واقعی خواب دیکھتی ہو؟''

ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ اگر تمہیں میری باتیں اچھی لگتی ہیں تو سنو ورنہ چلے جاؤ۔''

وہ غصّہ سے بولی۔

''نہیں تم بولتی رہو۔'' مجمع سے آواز اٹھی۔

''میں نے خواب میں دیکھا میں ایک ایسی سرزمین پر پہنچ گئی جہاں کے لوگ اپنی زمین پر اپنا مکان نہیں بناتے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم اپنی زمین پر رہنا کیوں نہیں چاہتے۔ تو انہوں نے چند لوگوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ میں ان سے پوچھوں۔ انہوں نے ہمیں نئی زمین ڈھونڈ کر دی ہے۔ میں ان کی طرف گئی اور ان سے بھی یہی سوال کیا کہ تم اپنی زمین پر اپنا مکان کیوں نہیں بناتے، تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم ہمیشہ سے نئی زمینوں کی دریافت کرتے رہے ہیں اور اب ہماری دریافت اسی کرہ ارض پر مکمل ہو گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب تم کوئی اور زمین دریافت کر لو گے تو کیا کرو گے۔

''پھر ہم کوئی نئی دریافت کریں گے۔''

''اور یہ زمین؟''

یہ زمین اس وقت تک ہماری دریافت کی وجہ سے اس قابل ہی نہیں رہ جائے گی کہ اس پر کوئی مخلوق رہ سکے۔ میں نے کہا تم دریافتیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ وہ ہنسے لگے اور کہنے لگے پھر ہم کیا کریں۔ جب ہم کچھ بنا نہیں سکتے تو کچھ بگاڑ دیتے ہیں۔ تا کہ ہمیں اطمینان ہو کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔''

وہ لوگ اس کا خواب سنتے اور کہتے کیا تم نے کوئی اور خواب دیکھا۔''

''ہاں میں نے ایک اور خواب دیکھا ہے۔ وہ تم لوگوں سے متعلق ہے۔ میں نے دیکھا کہ تم میں سے ہر ایک چوراہے پر کھڑا بول رہا ہے اور وہی کچھ بول رہا ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لوگ بڑی توجہ سے سننے لگے۔ عورت ایسے خواب کی باتیں کر رہی تھی جو وہ خود دیکھنا چاہتے

تھے۔ لیکن حاکم کے آدمیوں نے سن لیا کہ عورت اپنی زمین کی بات کر رہی ہے اور اس زمین پر اس زمین سے متعلق بولنا منع تھا۔ وہ اس عورت کو خاموش کر کے جانے کہاں لے گئے۔ وہ لوگ جو اس عورت کے خواب سنتے تھے انہیں اس عورت کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ تب ان میں سے ایک نے اپنا خواب سنانا شروع کردیا۔ اب اس شہر میں کئی خواب سنانے والے موجود ہیں مگر وہ اپنی زمین کی باتیں نہیں کرتے اس زمین کے باتیں صرف حاکم کے آدمی کرتے ہیں۔ جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

کہانی ایک شہزادی کی

وہ جلا وطن شہزادی تھی مگر جس بستی میں آئی تھی اس بستی کے لوگ کب یہ مانتے کہ وہ شہزادی ہے، سو اس نے کہا کہ وہ آزاد کردہ کنیز ہے اور اب خود مختار زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ تب اس کے گرد ایسے کتنے ہی لوگ جمع ہو گئے جنہیں کنیز رکھنے کی خواہش تھی مگر خریدنے کی استطاعت نہیں۔ شہزادی اس صورتحال سے پریشان نہیں تھی وہ جانتی تھی جب جلاوطنی ختم ہو گی تو ان میں سے کئی اس کے غلام ہوں گے۔

شہزادی اس سرزمین سے آئی تھی جہاں باغ سرسبز اور کھیت سنہرے ہوتے تھے۔ خود اس کا اپنا رنگ بھی سنہرا، آنکھیں چمکیلی اور بال گھنے سیاہ تھے۔

ایک روز بستی کے بوڑھے بادشاہ نے شہزادی کو دیکھا اور اپنی عمر بھول گیا۔ شہزادی پہلے تو پریشان ہوئی پھر اس نے بادشاہ سے کہا آؤ نشانہ بازی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر تم جیت جاؤ تو میں تمہاری ہوں۔ شہزادی نے تیر سے ایک بیضے کو نشانہ بنایا۔ بادشاہ نے کمان اٹھائی تو اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ تب بادشاہ کو اپنی عمر یاد آئی اور اس نے شہزادی کا خیال دل سے نکال دیا۔ شہزادی کی پریشانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ بادشاہ نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ بادشاہ زادی اور وزیر زادی کو تیر اندازی سکھائے۔ شہزادی جو محلوں کی سازشوں سے واقف تھی اور خود مختار زندگی

بسر کرنا چاہتی تھی اور سچ بولنا چاہتی تھی اس نے پیشکش قبول نہ کی۔ تب بادشاہ کے لوگوں نے اس کے خلاف باتیں شروع کر دی کہ وہ جادوگرنی ہے اور بادشاہ اس کے جادو کے اثر میں آتے آتے رہ گیا۔

شہزادی نے صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے بادشاہ کی پیشکش قبول کر لی۔ لیکن اس کے لیے جادوگرنی کا لفظ مشہور ہو چکا تھا۔ تب شہزادی نے شاہی طبیب سے کہا "جب میں جادوگرنی ہی کہلاتی ہوں تو مجھے ایسے نسخے بتا کہ میں جس کا علاج کروں وہ اپنی شفا کو جادو سمجھے۔" طبیب نے کہا کہ وہ اس کے معاوضے میں کیا دے گی اور شہزادی سوال کے معنی سے ڈر گئی۔

شہزادی کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی جس میں قیمتی ہیرا جڑا ہوا تھا جو اس نے کسی بہت ہی برے وقت کے لیے بچا رکھا تھا۔ اس نے طبیب سے کہا کہ یہ ہیرا اس کی آزاد کرنے والی مالکن کی نشانی ہے وہ معاوضے کے طور پر اسے لے لے لیکن پہلے اسے زہر کا نسخہ بتا دے۔ شہزادی جانتی تھی کہ یہ نسخہ صرف اس کے اپنے لیے ہے۔ دوسروں کے لیے تو وہ خیر کی جادوگرنی بننا چاہتی تھی۔ طبیب راضی ہو گیا۔ شہزادی تیر اندازی سکھانے اور طب سیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ لوگوں نے کہا شہزادی نے شاہی طبیب پر جادو کر دیا ہے۔

ایک دن ملکہ عالیہ بہت بیمار ہو گئیں تو شہزادی نے انہیں نسخہ تیار کر کے پلایا اور ملکہ کو شفا ہوئی۔ ملکہ نے شہزادی سے پوچھا کہ یہ کیا نسخہ تھا۔ شہزادی نے کہا یہ جادو کی وہ تہمت ہے جو مجھ پر لگائی گئی ہے، مگر آپ دیکھئے کہ مجھ میں خیر ہے شر نہیں۔ ملکہ نے اسے شاہی طبیب مقرر کر دیا اور لوگوں نے کہا کہ شہزادی نے ملکہ عالیہ پر بھی جادو کر دیا۔

شہزادی کو مادر ملکہ کے علاج کی ذمہ داری سونپی گئی جس کی تجربہ کار آنکھوں نے بھانپ لیا کہ وہ کوئی معمولی آزاد کردہ کنیز نہیں۔ اس نے شہزادی سے اس کی سابقہ مالک کا پتہ پوچھا تو شہزادی نے تین دن کی مہلت چاہی اور کہا کہ سابقہ مالکن کی اجازت کے بغیر ان کا پتہ نہیں دے سکتی۔ شہزادی نے اپنی ماں کو پیغام بھیجا کہ اگر کوئی اس کے متعلق پوچھتا ہوا آئے تو اسے اپنی آزاد کردہ کنیز ظاہر کرے۔ تب شہزادی نے مادر ملکہ کو اپنی ماں کا پتہ بتا دیا اور کہا کہ وہی اس کی سابقہ مالکن ہے اور ملکہ کا قاصد شہزادی کی والدہ سے تصدیق کے لیے آیا تو اس نے کہا ہاں اس کا مجھ سے ہی تعلق ہے۔ تب اس نے شہزادی کو آزاد کرنے کی وجہ پوچھی تو ملکہ گھبرا گئی اور کہا کہ اسے بہو بنانا چاہتی تھی جو ممکن نہ تھا۔

قاصد نے مادر ملکہ کو یہ باتیں بتائیں تو اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ کیوں نہیں شہزادی کو ولی عہد کے حرم میں شامل کر لیتی۔ لوگوں نے یہ سنا تو کہا اس نے مادر ملکہ پر جادو کر دیا ہے۔
شہزادی یہ سن کر پریشان ہوئی اور کہا کہ میں خیر کی جادوگرنی ہوں اور میرے پاس نسخہ شفا ہے جس کی تاثیر کے لیے پاکیزگی شرط ہے۔ مجھے ناکتخدا ہی رہنے دیا جائے۔ مادر ملکہ نے یہ عذر قبول کر لیا مگر شہزادہ جو خیر کی جادوگرنی کے قصے سن چکا تھا اس کا اشتیاق بڑھا اور اس نے کہا کہ عقد سے پاکیزگی متاثر نہیں ہوتی۔ تب لوگوں نے کہا ولی عہد پر بھی جادو کر دیا گیا۔
ایک دن شہزادی جب تیراندازی سکھانے میں مصروف تھی ولی عہد نے اس سے کمان لے لی اور بیضے کو نشانہ بنایا اور کہا کہ میں نے تمہاری شرط پوری کر دی، اب تم میرے عقد میں آ جاؤ۔ شہزادی نے کہا میری یہ شرط تمہارے لیے کب تھی۔ ولی عہد نے کہا پھر میرے لیے اپنی شرط بتا دو۔ شہزادی نے کچھ تامّل کے بعد کہا کہ میرے وطن پر ایک غاصب کا راج ہے اگر تم اسے شکست دو تو میں تم سے عقد پر تیار ہوں۔ ولی عہد نے شرط مان لی اور شہزادی کے وطن پر چڑھائی کی۔
ولی عہد کی فتح نے شہزادی کا راز کھول دیا اور اب وہ خیر کی ملکہ کہلاتی ہے۔

وہ بچہ

اس ہسپتال میں ایک انٹرنیشنل ورکشاپ میں ہو رہا تھا۔ ورکشاپ میں شرکت کے لیے بھی سفارش چل رہی تھی۔ میں ایک سہیلی کے لیے دعوت نامہ لینے گئی تھی۔ میری سہیلی جو ڈاکٹر ہے اور اس کی پریکٹس بہت چلتی ہے۔ اس کے لیے اس ورکشاپ میں شرکت منافع بخش ثابت ہوسکتی ہے۔ ہسپتال میں مریضوں کی بھیڑ تھی۔ ڈاکٹر ورکشاپ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سارے ڈاکٹر سیمنار روم میں جمع تھے۔ میں نے اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے ان تک رسائی حاصل کی اور کارڈ لے آئی جس پر میری سہیلی بہت خوش ہوئی۔ آتے جاتے میں نے مریضوں کی بھیڑ دیکھی جنھیں ورکشاپ کے اختتام تک انتظار کرنا تھا۔ ان میں وہ خواتین بھی تھیں جن کے یہاں ڈلیوری ہونے والی تھی۔ کیا یہ خواتین انتظار کرسکیں گی، میں نے سوچا۔ اس رات میں نے عجیب خواب دیکھا۔ میں ایک ہسپتال گئی ہوں وہاں ورانڈے میں کئی خواتین جن کے یہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹروں کی منتظر ہیں۔ مگر کوئی ڈاکٹر وہاں نہیں ہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک شور سا اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت جو دوسری طرف منہ کرکے لیٹی تھی اس کا رحم کھلا اور اس میں سے ایک بچہ باہر آیا مگر بچے کو کوئی تھامنے والا نہیں تھا۔ بچہ پھر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد بچہ پھر باہر آیا۔ پھر کسی نے نہیں تھاما تو اندر چلا گیا۔ میں نے وہاں کھڑی عورتوں سے کہا

کہ تم بچے کو پکڑتی کیوں نہیں؟ انھوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ تم کیوں نہیں پکڑتیں؟ میں نے کہا مجھے بچے پیدا کرانا نہیں آتا۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اتنے میں اس عورت نے کروٹ لی۔ وہ عورت میری ماں تھی۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور پھر دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ خواب میرے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ اگر مجھے پہلے ہی پتہ ہو کہ یہ عورت میری ماں ہے تو کیا میں ڈاکٹر کو بلاتی۔ کیا میں خود بچے کو تھام لیتی، میں نے یہ خواب دیکھا کیوں۔ اسے لکھوں تو علامتی کہانی بن جائے۔ اتنی واضح علامت...... ماں بار بار بچے کو جنم دے رہی ہے، ہم سنبھال نہیں پاتے۔ یہ سب سوچتی رہی اور خواب بدستور میرے ذہن پر چھایا رہا۔ ماں کو ہی کیوں دیکھا، اس کا تو انتقال بھی ہو چکا ہے۔ بچہ باہر تھا یا پھر اندر چلا گیا تھا...... اب وہ کہاں ہے۔ کیا دوبارہ یہ خواب دیکھا جا سکتا ہے...... دوبارہ خواب...... اتنا تکلیف دہ...... کس لیے، صرف بچے کو سنبھالنے کے لیے...... اس تکلیف دہ عمل سے گزرنا ضروری ہے کیا۔ یہ سوچتی ہوں اور سو جاتی ہوں۔

ٹھہری ہوئی یاد

سیما نے جب دروازہ کھولا تھا تو اُسے معلوم نہیں تھا کہ یہ دستک کس کی تھی۔ اس کے اپارٹمنٹ کمپلیکس کا سیکورٹی نظام ایسا تھا کہ جو بھی آتا چوکیدار خود اس کے بارے میں مکمل تسلی کرکے دروازے تک رہنمائی کرتا۔ جب دروازہ کھلنے پر اس نے خالد کو دیکھا تو وہ بالکل توقع نہیں کررہی تھی بلکہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ یوں آجائے گا۔ پچیس سال بعد۔

شام ہوچکی تھی۔ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی تاکہ اسے اندر آنے کا راستہ مل جائے۔ اس کے داخل ہونے اور بیٹھنے کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو گزرے ہوئے لاتعلق وقت کا پتہ دیتی۔

''کب آئے اور میرا پتہ کیسے چلا؟''

''کل ہی آیا ہوں اور تمہارا پتہ ہمیشہ میرے پاس رہا۔''

تو شام ہونے کا انتظار کیوں کیا۔ سیما نے سوچا۔ پر اس نے سوال پڑھ لیا تھا۔

''شام تو ہونی ہی تھی۔ طویل سفر کی تھکن جو تھی۔ تم کیا کرتی رہیں؟''

''آرام'' اس نے جواب دیا۔

اور واقعی اس نے آرام ہی تو کیا تھا، اماں نے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔ وہ پڑھتی

لکھتی اور تصویریں بناتی، یہی فن اس کے کام آیا تھا۔ وہ آرٹ اسکول جو اس نے کھولا تھا اس کا حساب کتاب بھی اماں ہی رکھتی تھیں۔ وہ تو بس تصویریں بناتی یا تصویریں بنانا سکھاتی۔ یہ ایسا کوئی کام نہیں تھا جس سے وہ تھکتی۔ رنگوں میں اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اپنے گرد رنگوں کی ایک فضا تخلیق کرلی تھی۔ پیڑوں کا رنگ، زمین کا رنگ، آسمان کا رنگ، پھول، تتلیوں، بیر بہوٹی، جھاڑ پر لگی بیریوں اور اماں کے دوپٹوں کا رنگ، کتنے ہی رنگ تھے جو اس کے گرد بکھرے ہوئے تھے۔

بچپن میں رنگوں کے سلسلے میں ایک مرتبہ اسے مایوسی بھی ہوئی تھی۔ جب اس کے والدین نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ڈھاکہ جاکر آباد ہوں گے۔ جہاں اس کے خاندان کے بیشتر لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی کہ دور سمندر پار ایک اور شہر ہے، یقیناً اس کی زمین کا رنگ مختلف ہوگا۔ مستقل خاکی زمین دیکھ دیکھ کر اس نے سوچ لیا تھا کہیں دور کسی اور رنگ کی زمین ہوگی۔ لیکن اس صبح جب اس نے پہلی بار ڈھاکہ کی زمین دیکھی تھی تو اس کا رنگ بھی وہی تھا جو کراچی کی زمین کا تھا۔ تب اسے پتہ نہیں تھا کہ زمین، پانی اور خون کا رنگ ہر جگہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ بات بالکل سچ بھی نہیں۔ رانگا ماٹی کی زمین رنگین تھی۔ بے حد حسین سبزے سے ابھرتی ہوئی وہ لال زمین اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ رانگا ماٹی سے کبھی بھی واپس نہیں آتی۔ وہ تو چٹا گانگ بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی جہاں اس کے والد ایک فیکٹری میں جنرل منیجر تھے۔ مگر جب وہاں کے حالات بگڑے تو اس کے والد نے تینوں بیٹیوں کو بیوی کے ساتھ کراچی بھیج دیا۔ کراچی جو اس کی پیدائش کا شہر تھا جس کی جنگلی بیریوں، بیر بہوٹیوں اور سمندر کا رنگ اس کی بچپن کی یادوں میں محفوظ تھا۔ وہ یادوں میں ڈوبی ہوئی تھی ان رنگوں میں کانچ کی گولیوں اور پتنگوں کا بھی رنگ شامل تھا جو اس کو ناصر نے اس صبح دی تھی جب وہ ڈھاکہ کی زمین کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ناصر اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ ''تمہیں یہ گولیاں کھیلنی اور گڈی اڑانی آتی ہے؟'' ناصر نے اس سے پوچھا تھا۔ ''ہم انہیں کنچے کہتے ہیں میں نے کھیلی نہیں مگر جمع کی ہیں۔ یہ گڈی نہیں پتنگ ہے۔ لڑکیاں پتنگ نہیں اڑاتیں۔ گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ ہم گڑیا کو گڈی کہتے ہیں۔''

اسے تو ویسے بھی ہر رنگین چیز جمع کرنے کا شوق تھا۔ رنگین چاک، چاکلیٹ کی پنی، مور کے پر، ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، کنچے اس کے کھلونوں کے ذخیروں میں ایسی چیزیں محفوظ تھیں جو

ڈھاکہ جاتے ہوئے پھینک دی گئی تھیں۔ ناصر نے اسے کنچے کھیلنا اور پتنگ اڑانا سکھایا تھا۔ ناصر سے اس کی پہلی دن ہی گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اسکول میں اس کی کلاس بھی ناصر کے ساتھ تھی۔ ابتدا میں اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ناصر کی کلاس میں ہی بیٹھے۔ ان کی یہ معصوم دوستی عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اس میں کوئی رومانس یا ناولوں، افسانوں والی محبت داخل نہیں ہوئی۔ بس ایک جذبہ تھا اپنی چیزوں، اپنی باتوں اور رازوں میں شریک کرنے کا۔ اس کے خاندان میں لڑکیوں کی کمی تھی۔ ناصر بڑے بھائی اور سہیلی دونوں کی کمی کو پورا کر رہا تھا۔ وہ اس کے شوق کو سراہتا۔

میٹرک کے امتحانات کے بعد چھٹیوں میں اسی نے آرٹ کلاسز میں داخلے کی ترغیب دی تھی اور کورس کی تفصیل بھی لایا تھا۔

خالد سے ملاقات بھی ناصر کے ہی ذریعے ہوئی تھی۔ وہ ناصر کے دوست کا بڑا بھائی تھا۔ خالد میڈیکل کالج میں ڈینٹسٹری کے چوتھے سال میں تھا۔ جب اس کے دانت میں تکلیف ہوئی تھی حسب دستور ناصر کے ہی ذمہ لگایا گیا تھا کہ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ ناصر کے دوست نے بڑے بھائی کا پتہ دیا تھا۔ وہ ان دنوں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوکر مصوری کا باقاعدہ کورس کر رہی تھی۔ خالد کو جب اس کے شوق کا پتہ چلا تو اس نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اسے آرٹسٹ پیشنٹ کہتا تھا۔ اس کے دانت پر ایک اور دانت نکل آیا تھا جو تکلیف دے رہا تھا۔ خالد نے وہ فاضل دانت نکال دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ عقل داڑھ تھی۔ اب تم اچھی آرٹسٹ بن جاؤ گی کہ آرٹسٹ کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ کہہ کر وہ ہنسا تھا تو اسے خالد کی شخصیت خوشگوار لگی تھی۔ پنجابی ماں کی رنگت اور بنگالی باپ کے نقوش کے امتزاج نے اسے کسی فلمی ہیرو سے زیادہ ہینڈسم بنا دیا تھا۔ اور پھر اس کی حس مزاح اور خوبصورت ہنسی سے وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ متاثر تو خالد بھی ہوا تھا، اس کی ذہانت اور سنجیدگی اور آرٹ سے لگاؤ سے۔ جب ہی وہ اکثر ان کے گھر آنے لگا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ بڑی بہن کی شادی ماں نے اپنے بھائی کے لڑکے سے لاہور میں کی ہے تاکہ میکے سے تعلق قائم رہے۔ اس کا بہنوئی فوج میں ڈاکٹر ہے۔ آج کل کیمبل پور میں پوسٹنگ ہے۔ اس نے اپنی والدہ کی والد کے ساتھ ملاقات کا دلچسپ واقع بھی سنایا اس کے والد سول سروس کا امتحان پاس کرکے ٹریننگ پر لاہور گئے ہوئے تھے جہاں اس کے نانا ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ ایک روز جب نانا نے پورے بیچ کو دعوت دی تھی۔ اس کی والدہ کی ایک سہیلی نے جسے بنگالی زبان آتی تھی، والدہ سے

کہا کہ بنگالیوں کے ہاں رسم ہے کہ جب کوئی مہمان آئے تو سلام کی جگہ کہتے ہیں ''آمی تمائے بھالو ماشی'' (مجھے تم سے محبت ہے) اس نے والدہ کو ان الفاظ کے اصل معنی نہیں بتائے تھے، بلکہ کہا تھا کہ بس یہ سمجھو How do you do۔ اس کی والدہ نے جب والد صاحب کے سلام کے جواب میں یہ الفاظ کہے تو ایک لمحے کے لیے وہ سمجھ نہیں سکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر جب انہوں نے والدہ کی سہیلی کی دبی دبی ہنسی سنی تو انہیں اندازہ ہوا کہ مذاق کیا گیا ہے۔ مگر یہ خوبصورت مذاق ایک رشتے کی بنیاد بن گیا۔ اس کے والد اور والدہ میں بہت محبت تھی۔ ذہانت اور حسن کے ساتھ بچوں کو ورثے میں تین زبانیں ملیں۔ اس کے دادھیال اور ننیال میں رابطے کی زبان اردو تھی۔ جب ہی وہ بڑی روانی سے اردو بولتا تھا۔ اس کی بہن کے بچے نہ بنگالی بول پاتے تھے نہ پنجابی۔ وہ انگریزی پڑھ رہے تھے اور اردو بول لیتے تھے۔ مگر یہ تو اس وقت کی بات ہے جب تم ادھر اور ہم ادھر کا نعرہ نہیں لگایا گیا تھا اور حالات نے نفرت کا رخ نہیں اختیار کیا تھا۔ جو فوج بنگال بھیجی گئی تھی اگرچہ اس میں خالد کا بہنوئی نہیں تھا لیکن اب وہ بنگالی بولتا تھا اور کسی کو نہیں بتاتا تھا کہ اس کا پنجابی بہنوئی فوج میں ڈاکٹر ہے۔ البتہ سیما کی محبت اکثر خالد کو کھینچ لاتی۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے ابا نے جب اسے اور اماں کو کراچی روانہ کیا تھا تو وہ ایئر پورٹ تک آیا تھا اور کہا تھا کہ ''آرٹسٹ پیشنٹ میں تمہارے واپس آنے کا انتظار کروں گا۔''

''اگر میں نہ آسکی تو......؟''

''تو پھر میں خود آؤں گا۔''

پھر نہ وہ خود آیا تھا نہ اس کی خبر آئی تھی۔ ابا کی موت کی خبر ضرور آئی تھی۔ تفصیلات بھی پتہ چلی تھیں جب مکتی باہنی کے لوگوں نے ابا کا دفتر گھیر لیا تو چوکیدار نے بندوق لے جا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ ''صاحب یہ بندوق ہے آپ فائر کرتے ہوئے دفتر سے نکل جائیں، یہاں آپ محفوظ نہیں ہیں۔'' مگر ابا تو کسی جانور کا خون بھی نہیں کر سکتے تھے ہجوم پر کیا فائر کرتے۔

''انہیں بلاؤ میں بات کروں گا، وہ کیا چاہتے ہیں؟'' پر ہجوم نے انہیں بات کرنے کی مہلت نہیں دی اور کئی گولیاں ان کے سینے کے پار ہو گئیں۔ اماں کو جب یہ خبر ملی تھی تو انہیں سکتہ ہو گیا تھا۔ تب سیما نے بڑی ہمت سے انہیں سنبھالا اور دونوں چھوٹی بہنوں کو بھی جو اسکول میں پڑھ رہی تھیں اور عمر کی اس منزل میں تھیں جب توجہ کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ سیما نے اس گھر میں جو والد نے ان کی رہائش کے لیے خریدا تھا ایک آرٹ اسکول کھول لیا۔ سیما سے چھوٹی

امینہ نے گریجویشن کے بعد سول سروس کا امتحان دیا۔ تربیت کے دوران اس کے ایک ساتھی کا رشتہ آ گیا۔ اماں نے دھوم دھام سے شادی کردی۔ دونوں میاں بیوی زیادہ تر اسلام آباد میں ہی رہتے ہیں۔ چھوٹی نعیمہ نے ایجوکیشن میں ایم اے کیا تو امریکہ میں اسپیشل ایجوکیشن کی اسکالر شپ مل گئی۔ پھر وہیں مشی گن یونیورسٹی میں اسے نوکری مل گئی۔ وہیں ایک نومسلم امریکن کو اس کوئی ادا اتنی بھائی کہ شادی کا پیغام دے دیا۔ اب دونوں میاں بیوی وہیں آباد ہیں۔ ناصر کو ابو ظہبی کے ایک بینک میں نوکری مل گئی۔ اماں کی زندگی سیما کے گرد گھومتی رہی۔ انہوں نے کئی مرتبہ اسے شادی کے لیے بھی کہا مگر وہ جواب مشہور آرٹسٹ تھی، ساری دنیا میں اس کی بنائی ہوئی تصاویر کی نمائش ہوتی تھی، اپنے کام میں اس قدر منہمک رہی کہ گزرتے ہوئے وقت کا کوئی حساب ہی نہیں رکھ سکی۔ آرٹ اسکول اور گھر کا حساب کتاب اماں سنبھال رہی تھیں وہ پوری توجہ اپنی مصوری کے شوق کو دے رہی تھی دل میں کبھی کوئی کسک اٹھتی تو برش اٹھالیتی اور رنگوں میں تحلیل کردیتی۔ ہجر اور ہجرت کے دکھ نے اظہار کی راہ پالی تھی اور اب پچیس برس کے بعد خالد اچانک آ گیا تھا۔

اس نے بھی سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کچھ اچھے دن نہیں گزارے تھے۔ یہ بات اس پر نظر پڑتے ہی عیاں ہوگئی تھی۔ اس کی امّی کے سب رشتے دار ساری دنیا میں بکھر گئے تھے۔ بیٹی پاکستان میں تھی، ابا کی جڑیں بنگال میں گہری تھیں۔ اس کے سگے چچا کے گھر ڈنر پر ہندوستان اور روس کے وہ پائلٹ مہمان تھے جو دو دن قبل اس کی زمین پر ہوائی حملے کررہے تھے۔ برطانیہ کی سینیٹ کا ایک رکن بھی آیا ہوا تھا۔ بڑی دیر ان بنگالی دانش وروں کا ذکر ہوتا رہا جنہیں پندرہ اور سولہ دسمبر کی رات قتل کیا گیا تھا۔ بڑے جذباتی انداز میں پنجابیوں اور بہاریوں کو برا کہا جارہا تھا اور وہ ایک پنجابی ماں کا بیٹا جس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ایک بہاری لڑکی سے شادی کرنا تھی، وہیں موجود تھا۔ اس کے اپنے جذبات کیا تھے، بنگلہ دیش بننے پر خوش ہونا چاہیے یا اپنوں کی جدائی پر رنجیدہ؟ کیا ان میں سے اکثر نے آزادی اس شکل میں چاہی تھی؟ پاکستانی افواج کی شکست اتنے سارے بہتے ہوئے خون اور پاکستان سے علیحدگی کی شکل میں؟ کاش ایسا نہ ہوتا۔ کاش الیکشن کے نتائج پر عمل ہوتا۔ وہ سوچتا، بہت سے لوگ سوچتے تھے۔ ابو بھی اداس تھے۔ امی کا چہیتی بیٹی سے ایسا رابطہ ٹوٹا کہ بحالی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ میکے کا کوئی فرد وہاں نہیں تھا۔ ابو نے سہارا دیا مگر وہ جذباتی طور پر اتنی بکھر گئی تھیں کہ ہسٹیریا کے

دورے پڑنے لگے۔ وہ جو خود ماں سے بہت محبت کرتا تھا اس صورت حال سے ٹوٹ سا گیا۔ ماں کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر ایک دن ان کو دل کا دورہ پڑا اور جان لیوا ثابت ہوا۔ بیٹی کو ماں کی موت کی اطلاع بہت دنوں بعد ایک تیسرے ملک کے ذریعے بھیجے جانے والے خط سے ملی تھی۔ حالات نارمل ہونے پر جب اس کا بہن سے رابطہ ہوا تو اس سے سیما کے متعلق پتہ چلا کہ وہ اب پاکستان کی نامور آرٹسٹ ہے اور ایک آرٹ اسکول چلا رہی ہے۔ وہ اس کے متعلق چھپنے والی ہر خبر اور رپورٹ کے تراشے بھی اسے بھیجتی رہی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پاکستان جائے اور اس سے ملے۔ اسے اپنا وعدہ بھی یاد تھا۔ مگر ابو اور چھوٹے بھائی کی ذمہ داری اب اُسی پر تھی۔ ابو پہلے ہی بیوی اور بیٹی کی جدائی کا صدمہ جھیل رہے تھے۔ ان کے دکھ بٹانے والے دوست بھی ہجرت کر گئے تھے۔ اب صرف وہ تھا اور اس کا بھائی احمد، جو ناصر کا دوست تھا۔ ناصر جس کی وجہ سے وہ سیما سے ملا تھا، عرب امارات جا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیما کا پتا ہونے کے باوجود اس نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ کیا فائدہ اس کی زندگی میں ہلچل مچانے سے۔ مگر جب ابو کا انتقال ہو گیا اور چھوٹا بھائی اپنی زندگی میں مصروف رہنے لگا تو اسے سیما کی شدت سے یاد آئی۔ ایک بار جانے میں کیا حرج ہے۔ اور رشتہ داروں سے بھی مل آؤں گا۔ دل نے توجیہ دی۔ سیما اور بہن، دو عزیز ترین ہستیاں اس زمین پر تھیں جس کا ویزہ لے کر اسے یہاں آنا پڑا تھا۔ یہاں اسے پولیس کے دفتر میں اپنی آمد کی رپورٹ بھی کروانی پڑی تھی۔ یہ زمین جو کبھی اس کا وطن تھی، اس کا ننھیال بھی، اب پردیس تھی۔ ایسے میں جب وہ سیما کے گھر داخل ہوا تو ایک مرتبہ ماضی کے کتنے ہی برس ذہن کے پردے سے تیزی سے گزر گئے۔ وہ پچیس برس پیچھے کھڑا تھا۔ ”پھر کسی دانت نے تکلیف تو نہیں دی؟“

”تکلیف دینے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا۔ دانت تو نکالے بھی جا سکتے تھے۔ دکھ جو روح میں پھیل گئے ان کا شمار کیسے ہو؟“

سانسوں کا تو کوئی شمار نہیں ہوتا۔ دونوں نے سوچا۔ ”کبھی وہاں آنے کا خیال آیا؟ تمہارے پاس تو میرا پتا تھا۔“

”کبھی کبھی جو چیز جہاں ٹھہر جاتی ہے اس کے وہیں رکے رہنے میں بہتری ہے۔ میں نے یادوں کو اسٹل (Still) کر دیا تھا۔ میں انہیں متحرک نہیں کرنا چاہتی۔ تم کیوں آئے ہو؟“

”میں نے کہا تھا نا کہ میں آؤں گا۔“

''پچیس برس کا عرصہ بہت طویل ہوتا ہے۔ وقت کو ری وائنڈ (Rewind) نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دونوں دریا کے دو کناروں پر چلتے رہے ہیں۔ اب اس پر پل بنانے کا وقت نہیں رہا۔ جاؤ، لوٹ جاؤ، دریا کی اس سمت جدھر تمہاری بستی ہے۔ پچیس سال پہلے شاید میں کچے گھڑے پر بیٹھ جاتی۔ مگر اب نہیں۔ اب میں جہاں کھڑی ہوں وہیں سے تمہیں آنے کے وعدے سے آزاد کرتی ہوں۔ واپس چلے جاؤ، اس سے پہلے کہ میں تم سے پوچھوں، تم یہاں کتنے دن ٹھہر سکو گے؟''

وہ مجھے دیکھ رہی تھی

اس کا جنازہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ سب سے کہا جا رہا تھا کہ آخری بار اس کا چہرہ دیکھ لیں۔ میں بھی آگے بڑھی۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے میں اسے نہیں، وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ یقیناً یہ میرا وہم تھا یا گمان۔ اس کی ساری زندگی میرے سامنے تھی۔ ایک سجا سجایا گھر، باحیثیت شوہر، خود اچھے عہدے سے ریٹائر ہوئی تھی۔ بچے پڑھ لکھ کر اپنی زندگی میں مصروف تھے۔ کامیاب بھرپور زندگی۔ ایسی زندگی تو خدا ہر عورت کو دے۔ پھر یہ وصیت کیا تھی۔

''میرے کفن دفن اور دیگر آخری رسومات کے اخراجات پر صرف میرے اپنے روپے خرچ کیے جائیں، جو میں نے اس مقصد کے لیے سیف میں رکھ دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی اور کچھ بھی خرچ نہ کرے۔ میرے شوہر بھی نہیں۔''

سیف سے جو رقم نکلی تھی وہ ان اخراجات کے لیے کافی تھی۔ پھر رسومات کا بڑھانا، گھٹانا اپنے ہی ہاتھ میں تھا۔ مگر یہ وصیت سب کو حیران کرنے والی تھی۔ لوگوں کو طرح طرح کے تبصروں کا موقع مل گیا تھا۔ خاص طور پر شوہر کو کیوں روکا، اخراجات کے لیے۔ قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں۔ تعلقات تو اچھے تھے دونوں کے۔ کبھی کوئی جھگڑا سننے میں نہیں آیا۔ ویسے بھی دونوں نے بڑی شرافت سے زندگی گزاری ہے۔ پھر کیا بات تھی؟

بڑی بوڑھیوں کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ ”ارے یہ نوکری کرنے والی عورتیں خود مختار ہوتی ہیں۔ یہی اُس کی مرضی ہوگی سو کرلی۔“ عمر رسیدہ خواتین نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ جیسے ایسا کچھ ہونا ان کی توقع کے مطابق تھا۔

مگر میں نے کیوں یہ محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیا میں نے اسے بہت غور سے دیکھا تھا۔ کیا میں اس کے چہرے پر پڑھنا چاہ رہی تھی کہ اس نے یہ وصیت کیوں کی تھی؟

”کسی کو جاننا چاہتی ہو تو پہلے اپنے آپ کو جانو۔ تم آئینے میں خود ہی کو دیکھتی ہو۔“ وہ کہہ رہی تھی یا شاید میں خود کہہ رہی تھی۔ تو کیا یہ وصیت میں نے کی ہے؟ ہاں شاید یہ میری وصیت بھی ہوسکتی ہے۔ مگر ساری عمر کے سمجھوتے کے بعد ایسا کرنا......نہیں میں یہ نہیں کرسکتی۔ یہ سچ ہے کہ جسے سب لوگ میرا گھر کہتے ہیں وہ صرف میری رہائش گاہ ہے۔ جس میں ایک کیل بھی میں اپنی مرضی سے نہیں لگا سکتی۔ اور جو میرے دن رات ہیں وہ میرے کب ہیں۔ کب سوتی ہوں؟ کب جاگتی ہوں؟ کیا کھاتی ہوں؟ کیا پہنتی ہوں؟ ایک عرصے سے میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ کبھی کپڑے اور زیور کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ سو جب سے اسے میری فضول خرچی کہا گیا ہے میں نے ایسی خواہش پیدا ہونے ہی نہیں دی۔ بچوں کی پیدائش، تعلیم و تربیت سب کچھ تو ویسا ہی ہوا جیسا میرے شوہر نے چاہا۔ میں تو بس اس پورے سفر میں ایک سائے کی طرح ان سب کے ساتھ چلتی رہی، کبھی آگے کبھی پیچھے، بہت واضح بھی نہیں۔ غائب بھی نہیں۔ کیا کبھی میرے ہونے کو محسوس کیا گیا؟ مجھے اس پر شبہ ہے۔ شاید کبھی ایسا ہوا ہو؟ پر مجھے اس کا یقین نہیں اور وہ جو اب آرام سے کفن پہنے لیٹی ہے اس نے خود کو محسوس کرانے کا کتنا منفرد طریقہ تلاش کیا ہے۔ اور اس کا شوہر؟ کیا اس نے بھی کچھ محسوس کیا؟ لوگ جنازہ اٹھانے آرہے ہیں۔ ان میں اس کا شوہر بھی ہے۔ میں غور سے اس کا چہرہ دیکھتی ہوں۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ میں آگے بڑھتی ہوں۔ ان کے اور جنازے کے بیچ کھڑی ہو جاتی ہوں۔ آج تو اسے اپنی مرضی سے جانا چاہیے۔

بے چاری

اپنے آپ پر روتے ہوئے لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے، خصوصاً عورتیں جب روتی ہیں تو ان پر ترس کے بجائے غصہ آتا ہے۔ میں خود رحمی، مظلومیت یا مکاری کے آنسوؤں میں فرق تلاش نہیں کر سکتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی روتی ہوئی عورت میرے سامنے آتی ہے تو اسے تسلی دینا میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ایسے میں وہ جو میری قریب ترین سہیلی ہے، میرے کاندھے پر سر رکھ کر روئی تو پہلی مرتبہ مجھے کسی رونے والی سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ پر تھوڑی دیر کے لیے۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کی بھڑاس نکل چکی تو میں نے اس سے پوچھا ''یہ بتاؤ یہ سب کچھ جو ہوا ہے، تم جھیل چکی ہو تو اب رو کیوں رہی ہو، طلاق ہوئی ہے نا تمہاری؟ اس کی بھی طلاق ہوئی ہے۔ وہ تو خوش ہے۔ تم رو رہی ہو۔ رو رو کے اسے مزید خوشیاں دے رہی ہو۔ یہ سکون بھی کہ تم اس کے فراق میں مبتلا ہو، تمہیں بڑی تکلیف ہوئی ہے اس کے جانے سے۔ جب کہ اسے تو بہت پہلے تمہاری زندگی سے نکل جانا چاہیے تھا۔ بلکہ تمہیں خود ہی نکال دینا چاہیے تھا۔ تم جتنی اچھی ہو، اتنا اچھا ہونا اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہے۔ مگر تم ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کے لیے جو ہمت چاہیے وہ تم جیسی شریف عورت میں نہیں ہوتی۔''

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اسے میری باتیں کیسی لگیں۔ مگر میں

اس کو اور اس کے شوہر کو گذشتہ پندرہ برسوں سے جانتی ہوں۔ وہ کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور وہ بھی کسی مشفق مالک کی طرح اسے پالتی رہی۔ ساری محبتیں اور آسائشیں اس پر نچھاور کر دیں، نہ کبھی اس نے اپنی جبلت دکھائی نہ کبھی اس نے اپنی محبت میں کمی کی۔ مگر اچانک پندرہ سال کے بعد وہ رسّی تڑا کر چلا گیا اور جب اس نے چمکارنے کی کوشش کی تو پہچاننے سے انکار کر دیا۔

''میں اب مزید قید نہیں برداشت کر سکتا۔'' اس نے بیچ میں پڑنے والوں سے کہا۔ پندرہ برس کی رفاقت اچانک قید میں کیسے بدل گئی، اس سوال کا جواب اس نے نہیں دیا۔ مگر مجھے پتہ ہے کہ اس بار اسے اپنے قبیل کی عورت مل گئی تھی۔ آدھی عورت، آدھی جانور، اس کے اپنی ہی طرح کی۔ مغرب کی سوسائٹی میں ایسا ہونا عام سے بات ہے۔ میں نے اپنی سہیلی سے کہا ''تم غور کرو۔ یاد کرو۔ وہ مکمل انسان کبھی نہیں رہا ہوگا۔ ایک مرتبہ گالی دو۔ دیکھو تمہاری زبان سے اس کے لیے کیا لفظ نکلتا ہے۔'' پر وہ شریف عورت، ہے وہ اسے کیا گالی دے گی۔ جب میں نے اس سے کہا کہ جو دوسری عورت اس کی زندگی میں داخل ہوئی ہے وہ Bitch (کتیا) ہے تو وہ غصے سے اٹھی اور اس طرح چلی گئی جیسے میں نے خود اسے گالی دی ہو۔ کاش کہ وہ گالی دینے کے قابل ہوتی۔

اس سے پہلے بھی ایک ایسی ہی صورت حال میں، جب میں نے اپنی ایک سہیلی کو یہ مشورہ دیا تھا تو وہ بہت ہنسی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے اس سے کہا ''تم آئینہ دیکھو، کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ تمہارے ساتھ قہقہے لگانے کے لیے ایک بھیڑ جمع ہو سکتی ہے۔''

''باجماعت ہنسی'' وہ پھر ہنسنے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ملی تو اس نے بتایا کہ وہ ہر وقت تو بھیڑ میں نہیں رہ سکتی مگر یہ بات صحیح ہے کہ اگر کسی میں مزاح کی حس ہو تو اس کی رفاقت آسان ہو جاتی ہے۔ پھر اس نے اپنے لیے ایک ایسا رفیق تلاش کر لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ واقعہ میں اپنی دوسری سہیلی کو سناؤں گی۔ مگر پہلے اسے خود پر ہنسنا سیکھنا پڑے گا اور کیا وہ گالی...........؟

کہانیاں یاد رہ جاتی ہیں

آصف فرخی

"تم چھیلو، میں آتا ہوں......"

بس اس ایک فقرے سے بہت بچپن میں اپنی دادی سے سنی ہوئی پوری کہانی یاد آ جاتی تھی۔ چھیلنے کا ذمہ اصل میں شہزادے کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ اس کی آزمائش تھی۔ لیکن وہ ڈلیا وزیر زادی کے آگے رکھ کر یہ کہتا ہوا اگلے مرحلے کے لیے روانہ ہو گیا جہاں اُسے ایک شہزادی ملی۔ مگر مل کر کھو گئی اور پھر وہ شہزادی یہ پکارتی پھری کہ "میں نے پایا، میں نے کھویا......"

اتنا تو یاد ہے لیکن باقی کہانی مجھ سے گم گئی۔ کہانی بھلا کیسے گم ہو سکتی ہے؟ کہانی وہ بچہ نہیں بھرے میلے میں جس کی انگلیوں سے ماں کا ہاتھ چھوٹ جائے۔ کہانی وہ نیا سکہ بھی نہیں جو کھیت، منڈیر پھلانگتے بچے کی جیب کے پھٹے ہوئے کونے سے نکل کر گر جائے۔ میں نے وہ کہانی سنی اور میں بھول گیا۔ بہت دفعہ سنی تھی لیکن پھر یاد نہیں رہی۔ کہانی ختم، پیسہ ہضم۔ نہ وہ بچپن رہا اور نہ جاڑے کی راتوں میں، لحاف کے اندر لپٹا کر کہانی سنانے والی دادی اماں۔ یوں کہانی گم ہو گئی، کہانی یاد رہ گئی۔

کہانیاں گم کہاں ہوتی ہیں۔ کہانیاں یاد رہ جاتی ہیں۔ بلکہ جو یاد رہ جائے وہی کہانی ہے اور جو کہانی ہے، وہ دِل گم کردہ کا مدعا:

دل کہاں کہ گم کیجیے، ہم نے مدعا پایا

دل ملے نہ ملے، دل کا مدعا کہانی بن جاتا ہے۔ یا کچھ لوگ ایسا بنا لیتے ہیں۔ بھولی ہوئی کہانیوں کو یاد کرنے، دُہرانے، ان کی بازیافت کی تگ و دو سے ہم ایسے چند لوگوں کو لاکھ دلچسپی سہی، کہانیوں کا گم ہو جانا، شاید نہیں یقیناً ناگزیر ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو یہ کام شعوری طور پر کرنا چاہیے۔ کہانیوں کو خود بھلا دینا چاہیے، صفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہیے اور پھر کسی شہرِ ستم کی طرح جلا کر ان کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے بعد بھی جو بچ جاتی ہے، وہ کہانی ہے۔ بہت پہلے کسی کتاب میں پڑھی ہوئی اوسپ مینڈل اشٹام کی یہ ہدایت آتی ہے (جس کی سفّا کی سے ڈر کر اس پر عمل کرنے کی کبھی توفیق نہ ہو سکی):

"Destroy your manuscript, but save whatever you have inscribed in the margin out of boredom, out of helplessness, and, as it were, in a dream. These secondary and involuntary creations of your fantasy will not be lost in the world but will take their places belind shadowy music stands....."

مینڈل اشٹام شاعر تھا (اور کیا ہی رسیلا شاعر، ذہن کے تاروں اور دل کی رگوں سے تنا ہوا!) مگر اس کی نثر کانٹے کے تول کی ہے۔ روسی انقلاب، اسٹالن کی ہجو، پھر سیاست کے غیض و غضب کا نشانہ بن کر جلاوطنی اور قیدیوں کے کیمپ میں کسمپرسی کی لاوارث موت...... اس کی کتنی ہی نظمیں گم ہو گئیں مگر اس کے مداحوں کے چھوٹے سے حلقے نے انھیں زبانی یاد کر کے محفوظ رکھا۔ شاعر تو شاعر، میں تو اسے نثر نگاری کا ایسا آدرش سمجھتا ہوں جس کو کسی ستارے کی طرح چھو لینے کی بس تمنا کی جا سکتی ہے۔ مینڈل اشٹام کا احوال مجھے یاد آیا جب کہانی کے نام پر فاطمہ حسن نے مجھے ایک ڈائری تھما دی۔ کونے مڑے تڑے، تحریر بھی بدلی ہوئی...... اس ڈائری کی تاریخیں بھی بہت پرانی ہو چکی تھیں۔ جاپانی باغوں کے ساکت منظر، پنکھیاں، گل داؤدی، چائے کی رسوم، سفید و سرخ نقاب دار چہروں کی تصویروں کے درمیان سادہ رہ جانے والے صفحوں میں چند کہانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ پورے پورے صفحے خالی یا ان پر وہ نام، پتے، ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے جو کب کے بدل چکے ہوں گے...... اور حاشیے پر کہانیاں۔ گھبراہٹ یا بے زاری کے مارے تیز تیز، بے طرح اُتاری ہوئی۔ یہ تھیں فاطمہ حسن کی کہانیاں جو گم ہونے سے رہ گئیں۔

یہ بھی محض اتفاق ہوگا کہ یہ کہانیاں بچ گئیں بعض دفعہ کہانیاں غائب ہو جاتی ہیں مگر حاشیے پر ایک ضمنی اندراج رہ جاتا ہے جس سے پوری کہانی کا سراغ مل جاتا ہے۔ کہانی کا جانا بھی ایک سانحہ ہے اور اس کی بھی اپنی ایک کہانی ہے خوں کیا ہوا دیکھا اور گم کیا ہوا پایا...... یہ شگوفہ اس وقت کھلا جب فاطمہ حسن نے ایک دن اپنی ایک گم کی ہوئی کہانی کے بارے میں بتایا۔ نہیں، اس کہانی کا ذکر انہوں نے تب کیا جب عذرا عباس نے، جو خود ان دنوں اپنی کہانیاں جوڑ جاڑ کر جمع کر رہی تھیں، ایک دن اچانک ...... بالکل جس طرح کہانیوں میں ہوتا ہے...... کہا کہ کہانی تو وہ تھی جو فاطمہ حسن نے لکھی تھی۔ پھر نہ تو وہ چھپی، نہ لوگوں نے سنی۔ اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئیں اور میں نے سوچا کہ لکھنے والی سے ہی پوچھ کر دیکھوں کہ سارے فسانے میں جس بات کا ذکر نہ تھا، وہ کیا تھی۔ دراصل، فاطمہ حسن سے میری ملاقات جن حوالوں سے ہے، ان میں ادبدا کر کہانی ضرور آتی ہے۔ اب سے ایک کہانی بھر زندگی پہلے، انہوں نے میری بالکل ابتدائی کہانیوں میں سے ایک، اُس رسالے میں شائع کی تھی جس کی وہ مدیر تھیں۔ ان ہی زمانوں اور ایسے ہی رسالوں میں، میں نے ان کی ایک آدھ کہانی کی جھلک بھی دیکھی تھی اور ان کا ذکر محترمہ خالدہ حسین سے بھی سُنا تھا جو افسانہ نگار ہونے کے باوصف کہانی کی بہت اچھی پارکھ بھی ہیں۔ مگر ان دنوں ادبی حلقوں میں فاطمہ حسن کا نام سامنے آ رہا تھا تو شاعری کے حوالے سے اور ایک تازہ حیرت میں ڈھلی ایسی نظمیں اس نقش کو گہرا کر رہی تھیں:

گہری ہوتی شام
لان کی خالی کرسیاں
اور ادھوری لڑکیاں
(نظم ''شاخوں سے دور''، مشمولہ ''بہتے ہوئے پھول'')

اس وقت یہ آبی رنگوں کی تصویر معلوم ہوئی تھی۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اس کی بنت میں کئی ایک کہانیاں ہیں، ادھوری، گم کردہ کہانیاں۔ کہیں یہ خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ تو نہیں رہ گئیں؟ شاخوں سے دور مگر جڑوں سے قریب۔ یہ لڑکیاں پوری ہوتی ہیں تو کہانیوں میں۔ راستوں اور رشتوں کی پہچان، سوال کرتی ہوئی آنکھیں اور بڑھتے ہوئے ہاتھ، زمین سے بچھڑنے کے دُکھ اور نئی سمتوں کی بے یقینی...... اس طرح کی کئی ایک کیفیتیں ان کہانیوں میں اپنی جھلک دکھاتی ہوئی گزر جاتی ہیں:

''جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اپنے گرد رنگوں کی ایک فضا تخلیق کرلی تھی۔ پیڑوں کا رنگ، زمین کا رنگ، آسمان کا رنگ، پھول تتلیوں، بیر بہوٹیوں، جھاڑ پر لگی بیریوں اور اماں کے دوپٹوں کا رنگ۔ کتنے ہی رنگ تھے جو اس کے گرد بکھرے ہوئے تھے......'' (''ٹھہری ہوئی یاد'')

نہ رنگ ٹھہرتا ہے نہ کہانی۔ ایک آن کی آن میں یہ جا وہ جا، دونوں ہوا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح پتوں کے رنگ بدلنے میں ایک پورے موسم کا اشارہ ملتا ہے اسی طرح ان کہانیوں میں وہ کن مناہٹ سی ہے جس کی تفصیل میں اگر جائیں تو پورے کے پورے رومانوی ناول اور افسانے بن جاتے ہیں۔ یہاں جھلمل ہے، برکھا بہار نہیں۔

''اس میں ڈسکرپشن زیادہ ہو گیا ہے، یہ کہانی مجھے پسند نہیں'' فاطمہ حسن نے اس کہانی کے بارے میں مجھ سے یہ کہا جس کا اقتباس اوپر درج ہے۔ (یہ کہانی گم نہیں ہوئی، لکھنے والی نے خود ہی چھوڑ دی تھی۔) مجھے ان کی بات سے ہزار اختلاف سہی، اس سے بطور افسانہ نگار ان کا عندیہ مل جاتا ہے کہ وہ اشاریت کی قائل ہیں۔ اور یہی ان کہانیوں کا وصف کہ وہ بعض ایسے جذبوں کو سمیٹ لیتی ہیں جن کا فاطمہ حسن کی اس دور کی شاعری سے گمان ہی نہیں ہوتا۔ یہ جذبے تخلیقی شخصیت کی کسی گہری، دبی ہوئی تہہ سے اُبھر کر آئے ہیں اور ان کہانیوں میں بھی half-realized سے ہیں۔

ان کہانیوں میں سرکشی کا رنگ ہے، بغاوت نہیں۔ خود اعتمادی ہے، احساسِ برتری نہیں۔ بچپن کے کھیلوں میں اس لڑکی کو اپنے ''چارم'' کی جستجو ہے (اور ایک ادھورا سا اندازہ بھی) اور اس کا سامنا دُنیا کی نظروں سے ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک کہانی جس کا رنگ تیکھا تھا، اس پر شاید کراچی کے کسی بزرگ دانشور نے ٹوک دیا۔ پھر ممنوعہ چوتھی کھونٹ کے سفر میں اٹھے ہوئے قدم آدھے راستے سے پلٹ آئے۔ فاطمہ حسن کہتی ہیں، ان سے وہ کہانی گم ہو گئی۔

شاید ایسا ہوا ہو، شاید ایسا نہ ہوا ہو۔ کہانی گم ہو کر جائے گی بھی کہاں؟ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ وقت ناوقت کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ کون راستہ بھول گیا، مسافر کی کہانی؟ وہ کہانی کار گم ہو گیا۔ یا گم ہوتے ہوتے اس شاعر میں ضم ہو گیا جس کی حیثیت سے فاطمہ حسن نے ادبی ساکھ قائم کرلی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جھوٹی شہرت ہو اور وہ اصل میں کہانی کار ہوں، خود ایک کھوئی ہوئی کہانی؟ مگر نہیں، ان کی شاعری اور افسانہ نگاری ایک

دوسرے کو کاٹتی نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بھی شاعرانہ رمز و ایمائیت ہے (اس قسم کی نقلی اور کھوکھلی بلند آہنگی نہیں جسے نثر کی خرابی چھپانے کے لیے ''شاعرانہ'' کہہ دیا جاتا ہے)۔ ان کی ابتدائی کہانیوں میں دھیمی دھیمی رومانویت ہے تو بعد کی کہانیوں میں حکائی رنگ اور کہیں خواب کا سا بیان۔ ایک بچے کا مختصر سا ڈسکرپشن (بجائے خود غور طلب) ایک ورکنگ وومن کی مصروف زندگی کو خواب کے نیم اندھیرے سے جوڑ دیتا ہے اور یوں خارجی زندگی کی تکمیل اندرونی زندگی کے بیان سے جڑ کر مختصر سے نثر پارے میں ڈھل جاتی ہیں جو ایک مختلف ذائقے کا حامل افسانوی تجربہ ہے۔ ابھی تو ہم خواب میں ہیں، جب آنکھ کھلے گی تو کیا شاعرہ کہہ سکے گی کہ یہ خواب خواب افسانہ گم ہوگیا؟ اور کیا گم ہوجانے سے کہانی ٹل سکتی ہے؟

ایسی کہانیوں کو بڑی کوشش سے گم کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی ان کی یاد ایک پھانس کی طرح رہ رہ کر چبھتی ہے جب کوئی اچانک کہہ اٹھتا ہے، ''کہانی تو وہ تھی......''

یاد کرنے والوں سے کہانی کون چھین سکتا ہے؟ جو گم ہوکر بازیاب ہوجائے اور حافظے سے مٹائے نہ مٹ سکے، وہی تو کہانی ہے، کہانی جس کے ہونے میں ہم بھی داخل دفتر ہیں......

جنوری ۲۰۰۰ء

فاطمہ نے خوب صورت کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ لیکن یہ کہانیاں وہ اپنے آپ کو سناتی رہتی ہے
... اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ فاطمہ کی شاعری پر میرا کیا تاثر ہے تو میں کہوں گا کپاس کا ایک پھول جس میں آگ روشن ہے۔

قمر جمیل

سب سے زیادہ فاطمہ کی شاعری میں مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ جذبہ کی گہرائی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اظہار میں ایک رکاؤ، ایک ٹھہراؤ، ایک Restrain ہے، اس سے بڑی چونکا دینے والی امیجز پیدا ہو جاتی ہیں۔

پروفیسر کرار حسین

فاطمہ کی طبیعت میں اختصار ہے۔ چھوٹی سی نظم میں پوری بات کہہ دیتی ہے۔

فہمیدہ ریاض

کوئی گہری بات اس کے جی میں ہے جس سے وہ خود بھی بے خبر ہے۔ اس کی ساری شاعری اسی بات کی تلاش اور اس تلاش کے سفر میں جو اس پر بیتی، اس کا بیان ہے۔ اس بیان کا ہم کیا نام دیں؟

منیر نیازی

Rs. 150/=